خون پھر خون ہے
اختر پرویز

دارالسرور برہان پور کا پہلا افسانوں کا مجموعہ

خون پھر خون ہے

اختر پرویز

ناشر و مصنّف	اختر پرویز، سابق میونسپل کونسلر ۱۵ - خانقاہ وارڈ، برہان پور ایم پی - پن کوڈ : ۴۵۰۳۳۱
پہلا ایڈیشن	۱۹۹۲ء
تعدادِ اشاعت	۶۰۰
کتابت	جمال ہاشم مالیگاؤں
طباعت	عوامی پریس مالیگاؤں
سرورق	احمد حنیف مالیگاؤں
ترتیب و انتخاب	ریاض ہاشمی، برہان پور، ایم پی
قیمت	۲۴ روپے

تقسیم کار

- رشید بک ڈپو، منڈی بازار، برہان پور، ایم پی
- اسلم پرویز، منشا منزل، خانقاہ وارڈ، برہان پور

یہ کتاب
فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی
حکومتِ اتر پردیش، لکھنؤ
کے
مالی تعاون سے شائع ہوئی!

اِنتساب

استادِ محترم

خلشؔ جعفری

اور برادرِ محترم

شبیر محمّد عرشیؔ

کے نام!

"خون پھر خون ہے" میں رنگ و حرارت
ان کے اخلاص و محبّت سے ہے!

اب کے خزاں میں شاید سوکھے نہ پھول کوئی
مَیں نے بھگو دیا ہے سارا چمن لہو میں
کمالؔ صدّیقی

اختر پرویز

گزارشِ احوالِ واقعی

کتاب کا نام "خون پھر خون ہے" کیوں ؟

آج سے تقریباً بیس بائیس سال پہلے مَیں نے ایک افسانہ لکھا تھا جس کا عنوان مَیں نے "خون پھر خون ہے" رکھا تھا۔

یہ عنوان مَیں نے کیوں رکھا تھا؟ اس پر جب بھی غور کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ ملک کے ہر دلعزیز شاعر — ساحر لدھیانوی نے ایک نظم لکھی تھی۔ یہ نظم تو مَیں سُن کر یا پڑھ کر بھول گیا تھا، لیکن "خون پھر خون ہے" میرے لاشعور میں جیسے جم گیا تھا۔ اپنا افسانہ پورا کرنے کے بعد مجھے عنوان کی تلاش ہوئی تو نہ جانے کیسے "خون پھر خون ہے" یاد آیا۔

اس عنوان کے ساتھ میری یہ کہانی "شبخون" کھنڈوہ کے شمارے میں شائع ہوئی تھی — پھر ایک دن مَیں نے کسی سے ساحر صاحب کی وہ نظم پھر سُنی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ مَیں نے لاشعوری طور پر اپنی کہانی کا جو عنوان "خون پھر خون ہے" رکھا ہے، وہ ساحر صاحب کی دین ہے۔

اِس لیے مَیں اپنے افسانوں کے اس مجموعے کو "خون پھر خون ہے" کا نام دے رہا ہوں ؎

سُرخ ہونٹوں کی تازگی کے لیے خون کس نے دیا جوانی کا
مجھ کو پہچان اے نگارِ حیات مَیں ہوں عنوان تری کہانی کا

(پریم وار برٹنی)

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف! اختر پرویز

فہرست

••

پیش لفظ

"خون پھر خون ہے" ـــــ کاغذی پیراہن میں آپ کے پیشِ نظر ہے ۔ جو میرے افسانوں کا مجموعہ ہے جسے میں اپنا ایک خواب کہنا چاہوں گا ۔ واقعی یہ میرا ایک خواب ہے جو میں نے بہت پہلے دیکھا تھا ۔ جب میں نے اپنی سیاسی اور ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا تو پہلا پڑاؤ لائبریری تھا ، جنتا لائبریری ـــــ اور پھر انڈیا لائبریری ـــــ انہیں ترقی دینے کی جدّ و جہد میں مجھے یہ احساس ـــــ شدید طور پر ہوا تھا کہ دارالسرور کہلانے والے تاریخی شہر ـــــ برہان پور میں افسانوں کا ایک بھی مجموعہ شائع ہو کر منظرِ عام پر نہیں آیا ہے ۔ ادب کا گہوارہ کہے جانے والے اس شہر میں جہاں سیکڑوں ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جو آسمانِ علم و ادب پر ستاروں کی طرح آج بھی چمک رہی ہیں ، مگر جسے افسانوں کا مجموعہ کہا جائے وہ ایک بھی شائع نہیں ہوا ہے ۔

اردو ہی میں نہیں بلکہ کسی بھی دوسری زبان میں بھی برہان پور سے کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے ۔

جب بھی میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ لائبریری میں کتابوں کی فہرست بنایا کرتا تو اس کمی کو نہ صرف یہ کہ میں بڑی طرف محسوس کرتا بلکہ کہنا چاہیے کہ کڑھتا تھا ۔ میں نے ایک دن اپنے ایک ساتھی خلش جعفری کے سامنے اپنے اس احساس کو ظاہر کیا ۔

انہوں نے مجھ سے کہا : ہاں اختر ! یہ بات تو اپنی جگہ صحیح ہے لیکن اس پر اظہارِ افسوس کرنے سے بہتر ہے کہ ہم خود اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کریں ۔

اپنے عزیز ترین دوست کی یہ بات جیسے میرے دل میں گھر کر گئی۔ جلد ہی میں نے ایک چھوٹی سی کہانی "میدانِ عمل" لکھی، جو میں نے ہفت روزہ "سویرا" کے ایڈیٹر شری جمنا داس اختر کو بھیج دی۔ انہوں نے اس کہانی کو نہ صرف یہ کہ پسند فرمایا بلکہ اسے پہلے انعام سے بھی سرفراز فرمایا۔

جعفری صاحب کو جب میں نے سویرا کا وہ شمارہ دکھایا جس میں وہ کہانی شائع ہوئی تھی تو انہوں نے بھی بہت زیادہ تعریف کی، اور ہمت افزائی کرتے ہوئے انہوں نے ایک کہانی جو انگریزی میں تھی، مجھے ترجمہ کرنے کے لیے دی۔ اس کا ترجمہ کرتے وقت مجھے کچھ دقّت محسوس ہوئی، مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور ترجمہ کرکے جعفری صاحب کو دکھلایا۔ جسے انہوں نے بے حد پسند کیا اور بعد میں انہیں کے مشورے سے میں نے یہ کہانی دعقل مند خاتون) ماہ نامہ "کرنیں" (ناگپور) کی مدیرہ محترمہ شفیقہ فرحت صاحبہ (صدر انجمن ترقی اردو ہند، بھوپال مدھیہ پردیش) کو بھیج دی۔ "کرنیں" کے شمارے میں یہ کہانی شائع ہوئی تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

اِس طرح یہ سلسلہ چل نکلا۔ میں کہانیاں لکھتا رہا، وہ اخبارات ورسائل میں شائع بھی ہوتی رہیں، لیکن ان افسانوں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی مجھے بہت دنوں تک مہلت نہیں ملی، کیوں کہ اس درمیان میری سیاسی سرگرمیاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں،

شہر میں نگر پالیکا کے چناؤ ہوئے تو میں نے اپنے وارڈ سے چناؤ لڑا۔ جیت کر میں میونسپل کونسلر بنا۔ ۱۹۷۱ء میں ہولی کے موقع پر برہان پور میں فساد ہوا تو ہم نے بہت سی زیادتیوں کے خلاف بطور احتجاج صوبائی الیکشن کا بائیکاٹ کیا۔

جون ۱۹۷۵ء میں ملک میں ایمرجنسی کا نفاذ ہوا۔ ملک بھر میں گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ برہان پور میں بھی اس سلسلے میں شری پرمانند جی گوئیل جی والے وکیل (سابق ممبر پارلیمنٹ)، برج موہن مصرا (موجودہ اسپیکر مدھیہ پردیش اسمبلی) مولانا حفظ الرحمٰن

انصاری صاحب، ضیاء الحق ایڈوکیٹ، عبدالغفور صاحب توحید مرحوم، نند کشور جی دلوڈھا (مالک ملن ہوٹل)، بھرت سنگھ، اندراو سندے، چاچا فقیر چند جی کیور، برج ولبھ ہاتھی والا، شنیڈے وکیل، گنیشو دورے وکیل، سریندر کھاری والا (موجودہ صدر جنتا دل ضلع کھنڈوہ) کے ساتھ میری گرفتاری عمل میں آئی۔ میسا کے تحت ہمیں نظر بند کر کے اندور اور کھنڈوہ جیل میں رکھا گیا۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں مجھے رہا کیا گیا۔

پھر ایک دن باتوں باتوں میں یہ بات میرے سامنے آئی کہ ہمارا خود سے افسانوں کا مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اس وقت میں سیاست سے بیزار ہو کر پھر ایک مرتبہ "ادبی کنارے" آ گیا تھا۔ ساتھیوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اپنے افسانوں کا مجموعہ ترتیب دے کر شائع کراؤں۔ ڈاکٹر محمد شفیع صاحب مہوبوی نے اس سلسلے میں اپنے مفید مشوروں سے بہت نوازا ـــــ ان کی خواہش پر میں نے ان سے وعدہ تو کر لیا، لیکن جب افسانوں کو ترتیب دینے لگا تو مجھے بہت سی پریشانیوں سے گزرنا پڑا۔ خدا خدا کر کے میں نے اپنے افسانوں کا مسودہ تیار کر لیا، تو فکر لاحق ہوئی کہ اب اس کا کیا کروں؟ کرم فرماؤں نے پھر میری رہنمائی کی۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس مسودے کو اتر پردیش کے ثقافتی ادارے فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کو مالی اعانت کے لیے بھیج دوں۔ میں نے ویسا ہی کیا جیسا کہ انہوں نے مجھے مشورہ دیا تھا۔ اور مجھے اس وقت بے انتہا مسرت ہوئی جب کمیٹی ہذا کے صدر عالی جناب سید امیر حسن صاحب عابدی کا نوازش نامہ موصول ہوا۔ جس میں موصوف نے مجھے یہ خوش خبری دی کہ میرے مسودے "خون پھر خون ہے" کو کمیٹی نے مالی اعانت کا فیصلہ کیا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اندھے کو آنکھیں مل گئیں۔

کتابت اور طباعت کی جان لیوا پریشانیوں سے گزرنے کے بعد یہ کتاب آپ تک پہنچی ہے اب یہ انتظار ہے کہ آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں تو یہ اپنا سفر آپ کی دعاؤں کے ساتھ شروع کرے۔ دعا کیجیے کہ یہ اپنی منزل پر پہنچے۔ شکریہ

۱۸ نومبر ۱۹۹۰ء اختر پہ ورنہ

شب و روز

نام : اختر محمد خان ولد حاجی علی منشا خان افغانی پٹھان

آبائی وطن : ٹنڈول، سوات بنیر ضلع پشاور

تاریخ پیدائش : اسکول سرٹی فکٹ کے مطابق ۷ر اپریل ۱۹۳۲ء۔ نگر پالیکا برہان پور کے پیدائشی رجسٹر کے مطابق ۱۱ر فروری، والدہ صاحبہ مرحومہ کے کہے مطابق ۹ فروری (عید کے دن صبح آٹھ بجے)

تعلیم : ابتدائی تعلیم اردو اسکول برہان پور، میٹرک حکیمیہ کارونیشن ہائی اسکول برہان پور سے ۵۱ء میں۔ کچھ دن علی گڑھ میں تعلیم، چند وجوہات کی بنا پر آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔

شادی : ۵ر مئی ۱۹۵۳ء بروز منگل اندور میں ہوئی۔

شریک حیات : سلطنت جہاں عرف ملکہ بیگم بنت آصف میاں پہلوان اندور

اولادیں : اسلم پرویز، انیس منشا، رئیس منشا، نفیس منشا، ثمینہ اختر، زلیخا اختر، فہمینہ اختر۔

سابق ممبر نگر پالیکا برہانپور (وارڈ خانقاہ برہانپور سے دسمبر ۶۷ء سے ۳۱ر دسمبر ۷۳ء تک)، سابق سکریٹری سیرت کمیٹی، سکریٹری سیفیہ حمیدیہ یونانی طبیہ کالج برہانپور، سکریٹری بیڑی کامگار یونین، آفس سکریٹری کمیونسٹ پارٹی، سکریٹری انتظامیہ کمیٹی درگاہ حبیب شاہ، وائس پریسیڈنٹ بیلو کا تکیہ کمیٹی، ممبر امن کمیٹی شہر اور ضلع کھنڈوہ

جیل یاترا : ۲ر اگست ۷۵ء سے مارچ ۷۷ء تک سینٹرل جیل کھنڈوہ (زیر تحت میسا نظر بندی)

دوسری بار ۱۶ر جنوری سے ۲۱ر جنوری تک کھنڈوہ جیل۔

سیاسی سرگرمیاں: شروع ہی سے کمیونزم اور ترقی پسند خیالات و نظریات کا حامی ہوں۔ جنتا لائبریری ۱۹۵۴ء کے آل انڈیا مشاعرہ سے ادبی و سیاسی زندگی کی شروعات ہوئی ابتدا میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا باقاعدہ و سرگرم ممبر رہا۔ بعد میں پارٹی سے استعفیٰ دے کر سوشل ورکر کی حیثیت سے عوام کی فلاح و بہبود کے مختلف کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ عوام کے اصرار پر خانقاہ وارڈ برہان پور سے ۱۹۶۷ء میں نگر پالیکا کا چناؤ لڑا اور کافی ووٹوں کی اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ اسی دوران طبیہ کالج برہانپور کے پہلے جوائنٹ سکریٹری اور بعد میں جنرل سکریٹری کی حیثیت سے کالج کا انتظام بہ حسن و خوبی سنبھالا۔ کالج کی بلڈنگ کے لیے زمین حاصل کرنے کی جدّوجہد تیز سے تیز تر کی۔ طلبہ کی بے چینی کے سبب کالج کی سکریٹری شپ سے استعفیٰ۔ ۱۲ر مارچ ۱۹۷۱ء کے دن ہولی پر شہر برہان پور میں ہونے والے فساد کو روکنے کے لیے انتھک کوشش کی۔ آتش زنی کرتے ہوئے ہجوم کو جہاں تک ہو سکا روکا۔ پولس فائرنگ کے دوران جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے عوام کو بچانے کی حتی الامکان سعی کی۔ لاشوں اور زخمیوں کو اسپتال پہنچایا۔ کہرام میں خوف و ہراس دُور کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کی۔ تین دن کرفیو میں گھر گھر لوگوں کو اناج پہنچایا۔

صوبائی الیکشن کے بائیکاٹ کی تحریک میں حصّہ لینے کی بنا پر میسا کے تحت نظر بند ہوا۔ ۲ر اگست ۷۵ء سے مارچ ۷۷ء تک سنیٹرل جیل کھنڈوہ میں زندگی کے دن گزارے۔ تہواروں کے موقعوں پر امن و شانتی بنائے رکھنے کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہا۔ ۵ر جولائی ۸۹ء کو صوبائی ایکتا سمیلن میں کھنڈوہ ضلع کی نمائندگی کی۔

••

مٹّی کا ڈھیر

کوٹھی کے صدر دروازے پر شوروغل سے مرزا صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں تعجب ہوا کہ رات کے پچھلے وقت کون لوگ شور مچا رہے ہیں۔

بارش دو دن سے ہو رہی تھی، اسے تھمے دو تین ہی گھنٹے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب ابھی ابھی اپنے ان تمام ساتھیوں کو رخصت کرنے کے بعد سوئے تھے جو خراب موسم گزارنے کے لیے اپنے ساتھ دل بہلانے کا سامان لیتے آئے تھے۔ یہ محفل تین بجے تک گرم رہی تھی۔

بے وقت نیند ٹوٹ جانے کی وجہ سے انہیں کافی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ مگر جھنجھلاہٹ کی جگہ بہت جلد خوف نے لے لی، کیوں کہ صدر دروازے پر آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ان کے دل پر ہمیشہ طاری رہنے والا خوف ابھرا، اور یہ خوف جب بھی شدت اختیار کرتا تو ان کو اپنی موت نظروں کے سامنے رقص کرتی نظر آتی۔

جاگیردار مرزا حیدر بیگ کی کوٹھی اپنے ارد گرد تمام کسانوں اور کھیت مزدوروں کی جھونپڑیوں کے بیچ ایسی دکھائی دیتی جیسے زمین پر پھیلا ہوا کوڑا کرکٹ جھاڑ کر ایک جگہ ڈھیری بنا دی گئی ہو، اور کچھ کوڑا کرکٹ جھونپڑیوں کی شکل میں پھر ادھر ادھر بکھر گیا ہو۔

کوٹھی شاہ آباد کے علاوہ قریب کے سبھی گاؤں میں مرزا حیدر بیگ کی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ کوٹھی کو بنے تقریباً سو سال ہو چکے ہیں۔ یہ کوٹھی تب بنی تھی جب مہاراج ایشور راؤ نے مرزا حیدر بیگ کو شاہ آباد کا علاقہ بطور جاگیر دیا تھا۔

مہاراج ایشور راؤ بھی عجیب آدمی تھے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ محل کے اس حصے میں تشریف فرما تھے جہاں سے نیچے گزرنے والی سڑک کا نظارہ کیا جاتا تھا۔

یکایک ان کی نظر ایک شخص پر پڑی جو اپنے دونوں ہاتھوں میں کبوتر لیے جا رہا تھا۔ انہیں کبوتر بہت اچھے لگے۔ اس آدمی کو فوراً طلب کیا۔ اس شخص سے دورانِ گفتگو وہ یہ کہہ بیٹھے کہ یہ کبوتر ہمیں بہت ہی پسند ہیں۔ اس نے فوراً ہی کہا: حضور! مجھے آپ کے ہاتھوں کے کنگن بہت پسند ہیں۔ جتنے لوگ بیٹھے تھے انہوں نے بڑے تعجب سے دیکھا کہ مہاراج نے بڑے اطمینان سے اپنے ہاتھ کے کنگن جو قریب قریب تیس ہزار کے تھے، دے کر کبوتر تھام لیے۔ کچھ دن بعد لوگوں نے یہ بھی سنا کہ مہاراج کو جب یہ بات یاد آئی کہ اس وقت مصاحبوں نے اس کبوتر والے کی بات کا کوئی معقول جواب کیوں نہیں دیا تھا ان سے کنگنوں کی قیمت سے زیادہ وصول کر لیا۔

مرزا حیدر بیگ نے جاگیر کی اچھی طرح دیکھ بھال کے لیے شاہ آباد میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ پہلے تو مہاراج الیشور راؤ اس کے حق میں نہ تھے۔ مگر جب جاگیر میں آئے دن لگان کی وصولی میں شکایتیں بڑھنے لگیں اور کسی بھی صورت وہاں ٹھیک ڈھنگ کا انتظام ہونے نہ لگا تو مہاراج کو با دلِ ناخواستہ اجازت دینی پڑی۔ کیوں کہ وہ خود وہاں رہ کر حالات کا معائنہ کر چکے تھے اور شاہ آباد کے معاملے کو سلجھانے کے لیے انہیں سپاہیوں سے بھی مدد لینی پڑی تھی۔

عمارت کو کوٹھی کا خطاب مہاراج کا ہی دیا ہوا ہے۔ مہاراج خود بھی مہینہ دو مہینے میں ایک آدھ چکر کوٹھی کا لگا جاتے تھے۔ ان کے آنے سے کوٹھی کے علاوہ شاہ آباد کی رونق بھی دو چند ہو جاتی۔ ایک میلہ سا ان کے آنے پر وہاں لگ جاتا۔

مہاراج رنگین طبیعت رکھتے تھے، اکثر ناچ رنگ کی محفل جمتی۔ اور اس پر ہی بس نہیں۔ شاہ آباد ان کا علاقہ تھا اور اس میں رہنے والے ان کی ملکیت، اس لیے وہ اپنی ملکیت کو جائز اور ناجائز طور پر استعمال کرنے میں کوئی برائی خیال نہیں کرتے تھے۔

کوٹھی بہت زیادہ زمین اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ دور سے دیکھنے میں کوٹھی ایسی نظر آتی کہ آج ہی بنی ہے مگر قریب سے دیکھنے میں اس کے بڑھاپے کی جھریاں بھی نظر آجاتی ہیں۔ سامنے کی طرف صدر دروازہ ہے۔ صدر دروازے اور عمارت کے درمیان ایک

بڑا صحن ہے، شمال میں باغیچہ ہے۔ باغیچہ کے سامنے ایک صحن ہے۔ صحن سے ملا ہوا بڑا دیوان خانہ ہے۔ دیوان خانہ بالکل مغل شہنشاہوں کے دیوان خانوں کے مانند سجا ہوا ہے۔ بڑی بڑی قدِ آدم تصویریں دیوار پر حسرت کی نظر کی طرح جمی ہوئی ہیں۔ عمدہ قالین فرش سے چمٹے پڑے ہیں۔ خوف ناک اور معصوم جانوروں کی کھالیں اور سوکھے ہوئے سر بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں۔

دیوان خانے کے بائیں طرف ایک کمرہ چھوڑ کر مرزا کی آرام گاہ ہے۔ جنوبی دیوار سے لگا ہوا ایک بڑا کمرہ ہے جو سارے جہاں سے قیمتی سامانوں سے بھرا ہوا ہے، جنہیں صرف بڑی بڑی تقریبوں میں آسمان دیکھنے کو ملتا ہے ـــ اور اس کے مغربی سمت دو کمرے ہیں۔ اگر ہم کوٹھی کو جسم مان لیں تو پھر لازمی طور پر ان دو کمروں کو دل و دماغ ماننا پڑے گا۔ وہ کمرہ جو جنوبی دیوار سے ساز باز کیے ہوئے ہے غلّہ کا گودام ہے، جس میں ہر قسم کا بے حساب اناج بوریوں میں پڑا سسک رہا ہے۔ اور اس کے شمال کی طرف جو کمرہ ہے اس میں وہ چیز رکھی ہوئی ہے جو دنیا کے پانچوں شرعی عیبوں سے بھی زیادہ چھپائی جاتی ہے۔ جس طرح شرعی عیبوں کو ڈھانپنے کے لیے اخلاق کی روحانی دیوار کھڑی کی جاتی ہے اسی طرح انڈے کی زردی اور سفیدی (سونا اور چاندی) کو چھپانے کے لیے فصیل نما دیوار کھڑی کی گئی ہے۔ جس کے بارے میں لوگوں کو شک ہوتا ہے کہ یہ وہی دیوار تو نہیں جس پر شہنشاہ بابر دو قوی ہیکل جوانوں کو بازو میں لیے دوڑتا تھا۔ جس کے دروازوں کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ شہر پناہ کے دروازے ہیں۔ اگر کسی کو اس کے اندر رکھی ہوئی چیزوں کو حاصل کرنا ہے تو اسے پہلے زمانے کی طرح ہاتھیوں کا استعمال کرنا پڑے گا۔ یا پھر آدمیوں کے ایک مجمع کو اپنے ہاتھوں میں لکڑی کے بڑے بڑے چیپٹے لیے ہوئے دوڑ کر ٹکر لینی پڑے گی۔

کوٹھی دو منزلہ ہے۔ اوپر والی منزل میں بھی دو تین کمرے ہیں اور ان پر کویلوؤں کی بڑی سی چھت ہے۔ کوٹھی کے ارد گرد کوئی دوسرا مکان نہیں ہے۔ صرف جنوبی دیوار سے لگا ہوا بابا شریف کا مزار ہے۔ یہ مزار بھی کوٹھی کے ہم عمر ہے۔ زمین پر مزار اس طرح لیٹا ہوا ہے جیسے پانی میں کسی بچے کی چھوڑی ہوئی کاغذ کی ناؤ، کسی چیز سے لگ کر تھم گئی ہو۔ جب کوئی ضرورت مند

باباشریف پر اپنی آرزو میں پیش کرتا تو یہی معلوم ہوتا کہ وہ شخص بچے کی ناؤ سے پار اُتارنے کی اِلتجا کر رہا ہو۔

مزار کی شہرت ٹڈی دل کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ جہاں بھی کوٹھی کا ذکر ہوتا تو وہاں باباشریف کے مزار کا بھی ذکر ہونا ضروری ہے۔ عرس ہر سال اس قدر شاندار ہوتا ہے کہ دُور دُور سے لوگ اپنے گھروں کا زیور رہن رکھ کر عرس میں شریک ہوتے ہیں۔ عورتیں بالخصوص وہ جو اولاد جیسی نعمت سے محروم ہیں یا جن کے خاوند کسی وجہ سے بددل ہو گئے ہیں باباشریف کو بہت مانتی ہیں۔ کسانوں اور کھیت مزدوروں کا بھی مزار پر بڑا یقین ہے' اور جب مرزا خاندان کا ظلم بڑھنے لگا تو کسان اور مزدور معمول سے زیادہ مزار پر دُعائیں مانگنے لگے۔

کچھ کسان اور کھیت مزدوروں نے فرداً فرداً حد سے بڑھتے ہوئے لگان اور بے جا ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ مگر اس آواز کا کوئی اصول نہ تھا۔ زندگی کی تڑپ اس آواز میں نہ تھی' ویسے ہی جیسے کوئی بیمار درد کی شدت سے چیخ اُٹھے۔ عقل سے بے بہرہ یہ آواز تھی' جیسے کوئی نیند میں پانی مانگ لے۔ دعاؤں میں آرزوؤں کی ضدیں نہ تھیں، جائز تمنّائیں مچلی نہ تھیں۔

جب بھی لوگ مل بیٹھتے اور اپنی مصیبتوں کا تذکرہ ہوتا، کوئی نہ کوئی کھیت مزدور یہ بھی کہہ دیتا کہ:

"بھئی مرزا صاحب نے کوٹھی بنائی' مرزا صاحب نے مزار بنایا۔ ان کی وجہ سے عرس کی دھوم دھام ہے تو پھر باباشریف ہماری مدد کیوں کر کر سکتے ہیں؟"

یہ سب ہی جانتے ہیں کہ مرزا حیدر بیگ کو جو علاقہ مہاراج السّور راؤ کی طرف سے ملا تھا اس میں باباصاحب کی دعاؤں کا بھی دخل تھا۔ باباشریف کی کرامات کے قصّے جہاں لوگوں کے زبان زد ہیں وہاں یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ مہاراج السّور راؤ کے مشہور درباری پہلوان "حیدر یا" باباشریف کی آڑ میں کوئی شرارت کر بیٹھا تھا۔ جس کے نتیجے میں باباشریف کا کمال ظہور پذیر ہوا۔ اور ان کی دُعائیں بچے کے روپ میں ظاہر ہوئیں۔ حیدریا پہلوان جاگیر

پلنے کے بعد مرزا حیدر بیگ کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔

قریب دس سال سے کوٹھی پر مرزا حیدر بیگ کے پوتے مرزا دلاور بیگ کا راج ہے۔ وہ درمیانے قد کے قوی جسم کے آدمی ہیں۔ ان کے چہرے کی گھنی مونچھیں جاگیر کی شان وشوکت کی کھلی کتاب ہیں۔ طبیعت کے ضدی اور تند مزاج ہونے میں ان کے والد مرزا اسکندر بیگ کی محبت کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ بچپن میں ان کا سر بھی دُکھتا تو کوٹھی میں ایک آفت سی مچ جاتی۔ مزار پر رات رات بھر دُعائیں مانگی جاتیں۔ بے تحاشہ روپیہ خرچ کیا جاتا اور آرام ہونے پر دھوم دھام سے رت جگے ہوتے۔ ان کی ہر خواہش بڑی سے بڑی قیمت دے کر بھی پوری کی جاتی۔ اسی طرح دعاؤں اور رت جگوں کے بیچ مرزا دلاور بیگ جوان ہوئے۔ اب بھی ان کو اگر معمولی بخار آجاتا تو وہ اپنے جسم کی ایسی حفاظت کرتے جیسے وہ ان کا اکلوتا بیٹا ہو۔

وہ ہوشیار مالی کی طرح اپنے پھل دار درخت کو کیڑا نہیں لگنے دیتے۔ وہ جیسے جیسے زندگی کے تیسرے دور کے نزدیک ہوتے جارہے ہیں ویسے زیادہ سے زیادہ دنوں تک زندہ رہنے کی آرزو نیم کی گلو کی طرح پھیلنے لگی ۔۔ درازیٔ عمر کی دُعائیں دینے والوں سے وہ بہت خوش رہتے۔

ان کے خوشامدیوں نے اگر ان کے لیے حسین سے حسین دُعائیں مانگ کر کچھ حاصل کیا تو اس کے مقابلے میں چند لوگوں نے جان سے مار دینے کی دھمکیاں دے کر۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کسان اور کھیت مزدوروں سے لگان اور ٹیکس وصول کرنے میں دَب جاتے ہیں۔ وہ کسی طرح بھی اپنے باپ دادا سے کم نہیں تھے۔ اس کام میں ان کی ہمّت کی داد دینی چاہیے کہ وہ آتنی مشکلیں ہونے کے باوجود جاگیر کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں۔

صدر دروازے سے اٹھنے والی آوازوں سے مرزا صاحب کو بہت جلد پتہ چل گیا کہ اب لوگوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی جارہی ہے اور شور کچھ اس طرح سے ہو رہا تھا کہ معاملے کی

نوعیت کو ان کا ذہن سمجھنے سے قاصر تھا۔

انہوں نے لوگوں کے اکٹھے ہو کر شور مچانے کی وجہ جاننے کے لیے بہت کان کھڑے کیے، مگر سوائے اس جملے کے وہ اچھی طرح کوئی دوسری بات سُن نہیں پائے۔ اور جملہ بھی ایسا تھا کہ جس کے سننے کے بعد ان کے بچے کھچے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اور ان کا دماغ "دیکھنا ادھر کوئی جانے نہ پائے" والے جملے کو دُہرانے لگا۔ اور ان کا خیال ایک دم اپنے والد کے وقت کے حادثہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ ایسی ہی رات کی بات ہے کہ وہ اپنے بستر پر میٹھی نیند سو رہے تھے، کہ شور و غل سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ شاہ آباد کے واسی صدر دروازے پر کھڑے چلّا رہے تھے۔

ہُوا یوں تھا کہ شام کے وقت گبّو چاچا کی چھوٹی لڑکی وحیدن کو جب کہ وہ بکریاں چَرا کر واپس آ رہی تھی کسی نے اغوا کر لیا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کوٹھی ہی میں موجود ہے کیوں کہ اس سے کچھ دن پہلے لگان کی وصولی کے وقت گبّو چاچا سے وحیدن کے متعلق بات چیت ہوئی تھی۔ مگر گبّو چاچا نے لگان کی معافی منظور نہ کی ـــ اس وقت مہاراج الشور راؤ کے لڑکے بھگونت راؤ جو اس وقت شاہ آباد کے جنگلوں میں شکار کھیلنے آئے ہوئے تھے اگر عین وقت پر نہ پہنچتے تو جانے کیا ہو گیا ہوتا۔

ابھی ان کا ذہن پچھلے واقعہ کو پوری طرح دُہرانے بھی نہ پایا تھا کہ ان کا نام لے کر دروازہ پیٹا جانے لگا۔ ان کے دل میں چُھپا ہوا خوف ابھرنے لگا۔ شاید کسانوں اور کھیت مزدوروں نے پھر کوئی جھگڑا نہ کھڑا کر دیا ہو۔

کچھ دیر کے لیے انہیں یہ بھی گمان ہوا کہ یہ لوگ ان سے بغاوت کر کے اور انہیں ختم کرنے کے بعد کوٹھی نذرِ آتش کر دیں گے اور یہ عیش و عشرت کا تمام سامان جل کر خاک ہو جائے گا اس خیال نے انہیں کچھ لمحوں کے لیے پریشان ضرور کر دیا۔ مگر بہت جلد وہ مطمئن ہو گئے، کیوں کہ انہیں بابا شریف کے مزار پر بھی بڑا اعتماد ہے۔ کیوں کہ وحیدن کے معاملے کے بعد جو بابا شریف کے مزار پر دھوم دھام ہوئی تھی اس سے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ کوٹھی اور اس کے مکینوں کو بچانے میں

ان کا بڑا دخل ہے کہ جب تک بابا شریف کا مزار کوٹھی سے لگا ہوا ہے یہ لوگ کوٹھی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کا بال بیکا کر سکتے ہیں۔ بابا شریف کا مزار قیامت تک سلامت رہے گا۔ اس لیے کوٹھی بھی سلامت رہے گی۔ مزار ہے تو کوٹھی ہے اور کوٹھی ہے تو مزار کی رونق ہے اور جب تک یہ دونوں طاقتیں موجود ہیں تو شاہ آباد کے کسان تو ایک طرف پورے ملک کے کسان مل کر ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

مرزا صاحب نے اپنے حواس پر قابو پا کر معاملے کی نوعیت معلوم کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ پلنگ سے اُتر کر دروازے کی طرف بڑھے۔ دلوان خانہ طے کرنے کے بعد وہ صحن میں آئے۔ صحن میں صبح کاذب کی روشنی اور پانی پھیلا ہوا تھا۔ وہ چوکیدار کو آواز دیتے ہوئے باغیچہ کی روش پر آ گئے۔ وہ ابھی دس بیس قدم بھی بڑھنے نہ پائے تھے کہ کھولیوں کی طرف سے انہیں چوکیدار اور باورچی ہاتھوں میں ڈنڈے لیے ہوئے آتے دکھائی دیے۔ مرزا صاحب کی آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی، ورنہ اس سے پہلے وہ چُپ سادھے اپنی اپنی کھولی میں بیٹھے تھے۔

مرزا صاحب نے پوچھنے کا اشارہ کیا۔ چوکیدار نے آواز لگائی:

"کون ہے؟"

آوازیں آئیں:

"دروازہ کھولو۔"

"کیوں؟" مرزا صاحب نے اپنی پوری طاقت یکجا کرتے ہوئے پوچھا۔

"کون؟ مرزا صاحب ۔۔۔؟" شاید ان لوگوں نے مرزا کی آواز پہچان لی تھی۔

"ہم ہیں آپ کے پڑوسی۔ باہر آئیے۔"

"اچھا ۔۔۔!" مرزا صاحب کے منہ سے اچھا اتنی جلدی نکلا کہ ان کو خود تعجب ہونے لگا۔

اب آوازیں دب گئی تھیں۔ مرزا صاحب صدر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سوچنے

لگے کہ دروازہ کھولنا چاہیے یا نہیں۔ ابھی وہ اس الجھن پر اچھی طرح سوچ بھی نہ پائے تھے کہ غیر شعوری طور پر چوکیدار کو حکم دے بیٹھے:

"دروازہ کھولو۔"

چوکیدار نے بڑھ کر صدر دروازے کی کھڑکی کا تالا کھولا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مرزا صاحب نے کھڑکی کی سانکل کھول کر پٹ کو ذرا چوڑا کیا، تو انہوں نے سامنے بہت سے لوگوں کو اپنا منتظر پایا۔ کچھ لوگ ان کی طرف بڑھے۔ مرزا صاحب نے گھبرا کر پٹ بند کر لینا چاہا مگر کچھ ہاتھوں نے بڑھ کر پٹ تھام لیے۔

"باہر تو آئیے۔"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟" مرزا صاحب نے گھبرا کر سوال کیا۔

"آپ کی دیوار گر گئی ہے۔" کسی نے جواب دیا۔

"کیا۔؟" مرزا صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں! آپ کی کوٹھی کی جنوبی دیوار گر گئی ہے۔ وہاں مٹی کا بڑا سا ڈھیر لگ گیا ہے جس میں بابا شریف کا مزار بھی دب گیا۔"

یہ سن کر مرزا دلاور بیگ کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسانوں اور کھیت مزدوروں کی بغاوت سے بھی بڑا انقلاب ہو گیا اور انہیں تصور میں تمام کوٹھی بیٹھتی نظر آنے لگی۔ انہوں نے گھوم کر کوٹھی کو دیکھنا چاہا مگر وہ ابھی اچھی طرح کوٹھی دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ چکرا کر گر پڑے۔

••

چاند بی بی

"یہ بھی کوئی زندگی ہے؟"

عثمان خاں چلتے چلتے رک گئے مگر ان کی سوچ نہیں رُکی۔ وہ سوچتے ہوئے پھر قدم بڑھانے لگے:

"عورت کے بغیر زندگی، کوئی زندگی ہے۔ مگر وہ عورت میرے کس کام کی؟ اب وہ آئے بھی تو کیا اور جائے بھی تو کیا؟ اس کے بارے میں سوچنا بھی فضول ہے۔ زندگی یوں بھی گزر رہی ہے --- نہیں میں گلے سے نوچ کر پھینکے ہوئے ہار کو اپنے سینے سے نہیں لگاؤں گا۔ آخر مجھے اپنی عزت کا کچھ پاس ہے کہ نہیں! پھر مجھے اس کی تمنا و خواہش کیوں ہو؟ وہ آئے یا نہ آئے اس کی مرضی۔"

ان ہی بے ربط سے خیالوں میں گم عثمان خاں اپنے گھر کی طرف آرہے تھے، جو انہوں نے شہر کی نئی کالونی میں پچھلے سال ہی بنا بنایا خریدا تھا۔ یہ مکان گلی کے نکڑ پر تھا۔ اس کے بعد کھلا میدان اور اسکول تھا۔

آج شام میں جب وہ اپنی دکان سے گھر کے لیے چلے تو وہ یہ زندگی اور وہ زندگی کے خیالوں سے گھرے ہوئے تھے۔ جب بھی وہ اکیلے ہوتے تو اس قسم کے خیالات میں گھرے رہتے۔ اس شام بھی وہ کچھ اسی قسم کے خیالوں میں الجھے ہوئے تھے۔

"یہ بھی کوئی زندگی ہے؟" ان کی سوچ کی شروعات اسی طرح ہوتی ہے، اور پھر وہ نہ جانے کہاں کہاں کی سوچتے۔

اپنی زندگی سے اوروں کی زندگیوں کے بارے میں خیال آرائی کرنا اور دوسروں کی زندگیوں کے بارے میں سوچتے سوچتے اپنے بارے میں سوچنا ان کا روز کا معمول تھا۔ اس شام

کو بھی وہ ہمیشہ کی طرح راہ چلتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

"اگر وہ آگئی تو ___" اپنے خیال پر وہ خود گھبرا سے گئے۔ انہیں اپنا وجود کانپتا سا لگا۔ ان کے بڑھتے ہوئے قدم کسی ضعیف کے قدموں کی طرح لڑکھڑانے لگے۔ اب گرے کہ جب گرے۔ راستہ چلنا ان کے لیے دشوار ہو گیا۔ خود پر قابو پانے کے لیے وہ چلتے چلتے رُک گئے۔

"نہیں ـــ وہ نہیں آئے گی۔"

ان کے قدم پھر اٹھنے لگے۔ گلی میں مُڑتے ہوئے ان کی گھبراہٹ کچھ کم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ اپنے مکان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ دُور سے اپنے گھر کا دروازہ کھُلا ہوا دیکھ کر انہیں پھر گھبراہٹ ہونے لگی۔

"پھر دروازہ کیوں کھُلا ہے؟" چلتے چلتے رُک کر انہوں نے خود سے سوال کیا۔

"شاید وہ آگئی ہے۔"

مکان کے صدر دروازے پر وہ رُک سے گئے۔ انہوں نے خاموش کھڑے رہ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ گھر میں موجود ہے یا نہیں۔ مگر انہیں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔ اور وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے احاطے سے برآمدے میں اور برآمدے سے گھر میں داخل ہوئے۔ بڑے کمرے میں بچھی ہوئی دری پر کاکی، ان کی بوڑھی ملازمہ کچھ سی رہی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے کاکی سے پہلا سوال یہی کیا:

"کیا وہ آئی ہے؟"

"کون؟" جواب دینے کے لیے کاکی نے گردن اٹھائی، اور پھر انہیں سامنے کھڑا ہوا دیکھ کر انہوں نے کہا "نہیں وہ نہیں آئی۔"

عثمان خاں نے اپنے اطمینان کے لیے پھر سوال دُہرایا:

"کیا سچ مچ وہ نہیں آئی؟"

"مَیں کیا جھوٹ بول رہی ہوں؟" سُوئی میں لگے ہوئے دھاگے کو دانتوں سے توڑتے ہوئے کاکی نے جواب دیا "کیا وہ آتی تو مَیں تم کو بتلاتی نہیں؟"

"تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے خدایا۔" وہ بے خیالی میں کہہ اٹھے۔ "وہ نہیں آئی اچھا ہُوا۔"

آہستہ چلتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آئے۔ پہلے تو انہوں نے اپنے ہاتھ کا اخبار ایک طرف رکھا اور پھر اپنی پتلون کی جیب سے شراب کی بوتل نکال کر میز پر رکھ دی، کپڑے تبدیل کیے اور پھر غسل خانے میں چلے گئے۔ جب وہ واپس آئے تو کاکی چائے لائے ہوئے ان کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا آج وہ آنے والی ہے؟"

"یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" چائے کی پیالی لیتے ہوئے عثمان خاں نے کہا۔

"آئے نہ بھی آئے۔" وہ کُرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگے، اور کاکی کمرے میں پھیلی ہوئی چیزوں کو اپنی جگہ رکھنے لگی۔

"تمہارا انتظار کرنا بے کار ہے۔" کپڑوں کو سمیٹتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"جب تم دونوں ایک نہیں ہو سکتے تو پھر انتظار کرنے سے کیا فائدہ؟"

"ہاں یہ بات تو ہے" چائے پیتے ہوئے عثمان خاں نے صرف اتنا کہا۔

"تم اسے اپنا کیوں نہیں لیتے؟" کاکی نے آخر یہ چبھتا ہُوا سوال پوچھ ہی لیا۔

جواب دینے میں عثمان خاں نے کچھ بے چینی محسوس کی۔

"مَیں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ طلاق کا اونچا پہاڑ جو درمیان کھڑا ہے وہ ہمیں کبھی ایک ہونے نہیں دے گا۔ طلاق بہت بُری چیز ہے کاکی۔"

یہ کہتے ہوئے عثمان خاں نے ایسا منہ بنایا جیسے ایک ہُوک سی اُن کے سینے

میں اُٹھ رہی ہے۔

"اس سے بھی بُری ہوتی ہے" کاکی نے شراب کی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جو تم روز پیا کرتے ہو۔"

"ہاں کاکی" کُرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے عثمان خاں ' نے چھت پر نظریں جمالیں۔ "اس سے بھی بُری ہوتی ہے طلاق۔ دونوں ہی حرام ہیں، مگر ایک حرام سے دل کو سکون ملتا ہے اور دوسرے حرام سے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ شراب کو روز صبح شام پیو تو کچھ نہیں ہوتا، مگر ایک مرتبہ طلاق، طلاق، طلاق کہو تو پھر تم کسی کے کچھ نہیں رہتے، اور کوئی تمہاری کچھ نہیں رہتی۔"

"پھر تم نے اس کو طلاق کیوں دی؟" کاکی نے آخر پوچھ ہی لیا۔

"بس دے دی۔" عثمان خاں ' نے چھت سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔ "تھی کچھ ایسی ہی بات جس نے میرے دل کا سکون مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا اور میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو طلاق دے دی۔"

کاکی بھی جیسے آج سب کچھ پوچھ لینے پر آمادہ تھی۔ انہوں نے دریافت کیا:

"پھر اب کیوں اس کی راہ تک رہے ہو؟"

"یوں ہی۔" عثمان خاں صاحب سے کچھ جواب نہ بن سکا۔ "یوں ہی — اس نے کہا تھا کہ میں آؤں گی۔"

"کیا طلاق کے بعد پھر وہ تمہاری نہیں ہو سکتی؟" کاکی نے پھر سوال کیا۔

"ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے حلالہ کرنا ہوگا، جو میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

کاکی نے پوچھا:

"یہ حلالہ کیا ہوتا ہے؟"

"حلالہ اس کو کہتے ہیں" عثمان خاں ' بولے "جس عورت کو طلاق دی

گئی ہو وہ طلاق کے بعد عدت کے دن گزارے اس کے بعد کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح پڑھوائے، اس کے ساتھ ایک رات گزارے، پھر اس کا خاوند اپنی مرضی سے اسے طلاق دے، پھر وہ عدت کے دن کسی غیر محرم کو دیکھے بغیر گزارے، اس کے بعد ہی پہلے والے شوہر سے اس کا نکاح جائز ہو سکتا ہے یہ سب کچھ میں سہہ نہیں سکتا۔ تھوکوں اور ـــــ"

"تمہاری باتیں تو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" کاکی نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا "تم جانو اور تمہاری وہ جانے۔ میں تو گھر جا رہی ہوں۔ کھانا تیار کر دیا ہے، کھا لینا۔ ایسا نہ ہو کل کی طرح رکھا رہ جائے۔"

"اچھا ـــ" کہتے ہوئے عثمان خاں مسہری پر دراز ہو گئے۔

جب کاکی کو گئے ہوئے چند لمحات گزر گئے اور ان کے دل کی بے چینی بڑھنے لگی تو وہ مسہری سے اٹھے اور میز تک گئے۔ انہوں نے چند اگر بتیاں جلائیں اور انہیں میز کے ایک طرف لگا دیا۔ پھر انہوں نے گردن اٹھا کر دیوار پر لگی ہوئی تصویر کو دیکھا جو اُن کی دوسری شادی کے وقت اتاری گئی تھی۔

کچھ دیر تو وہ یوں ہی اس تصویر کو گھورتے رہے پھر انہوں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر شراب کی بوتل اٹھالی۔ گلاس میں شراب اُنڈیلی۔ اس میں تھوڑا پانی ملایا اور پھر پورا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

"اب وہ آ بھی جائے تو کوئی پرواہ نہیں۔"

سینے میں جلتی ہوئی آگ انہوں نے اپنے سینے سے نیچے اُترتی ہوئی محسوس کی۔ پھر وہ مسہری پر آ کر لیٹ گئے۔ کمرے میں پھیلے ہوئے اگربتی کے دھوئیں میں ان کی زندگی کی کچھ سنہری یادیں دھیرے دھیرے ان کے ذہن کے پردے پر اُبھرنے لگیں:

ان کا گھر شہر کی مشہور و معروف شاہراہ کے کنارے تھا جس سے لگا ہوا ایک سنیما گھر تھا۔ ان کے بھرے پُرے خاندان میں سبھی رشتہ دار موجود تھے۔ ماں باپ، بڑا بھائی، چھوٹا

بھائی، چھوٹی بہن، بھاوج ـــــ مگر جن کو سگا کہا جائے وہ صرف باپ اور ایک بڑا بھائی تھا۔ باقی سبھی سوتیلے تھے۔

ان کی سگی ماں جس نے ان کو جنم دیا وہ کب اللہ کو پیاری ہوگئی ان کو نہیں معلوم۔ کہتے ہیں جب وہ بہت چھوٹے تھے تو وہ ایسی بیمار ہوئی کہ بستر سے پھر اٹھ نہ سکی۔ باپ بھی ان کے ہوش سنبھالنے سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہوگیا، اور پھر ایک دن ان کا بڑا بھائی بھی اپنے ماں باپ سے جا ملا۔ پھر وہ اس بھری پری دنیا میں اپنے اکیلے سگے رشتہ دار رہ گئے۔

ان کے والد نے مرتے وقت کوئی جائداد نہیں چھوڑی تھی۔ صرف ایک مکان تھا جس میں ان کا خاندان رہتا تھا جس پر سنیما گھر کے مالک کی بڑی نظر تھی۔ وہ اپنے سنیما کو وسیع کرنے کے لیے ان کا مکان کسی بھی قیمت پر خریدنا چاہتا تھا۔

ان کے والد کے پاس کوئی روپیہ پیسہ تو تھا نہیں جس سے وہ کوئی کاروبار کرتے، وہ منڈی بازار میں صبح شام پھل فروٹ بیچا کرتے یا پھر امرائیاں لیا کرتے تھے جن کے پھل وہ بازار میں لاکر بیچ دیتے تھے۔

جب وہ چھوٹی عمر کے تھے تو عثمان خاں کو یاد ہے کہ وہ اکثر اپنے والد کی پھل فروٹ کی دکان پر جو چند ٹوکروں اور ایک ٹاٹ پر مشتمل ہوتی تھی کبھی کبھی بیٹھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے بھائی بہنوں اور والد کے ساتھ اپنے والد کی لی ہوئی امرائیوں میں بھی جایا کرتے تھے۔ جہاں وہ تو اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلا کرتے اور ان کے والد اپنے ساتھیوں کے ساتھ درختوں سے پھل توڑا کرتے اور شام ہوتے ہوتے وہ گھر لوٹ آیا کرتے۔

والد کے مرنے کے بعد ان کے بڑے بھائی نے اس کام کو سنبھالا۔ وہ بھی دکان پر بیٹھنے لگے۔ مگر بہت جلدی ان کی طبیعت اُچاٹ ہوگئی۔ انہوں نے لکڑی کے کام کرنے والے مستری کے ساتھ مزدوری کے لیے جانا شروع کیا۔ پھر جب اس سے بھی ان کا دل بھر گیا تو وہ بیل گاڑی پر بوجھ ڈھونے کا کام کرنے لگے ـــــ پھر وہ کام بھی انہوں نے چھوڑ دیا۔ جنگل سے لائی ہوئی لکڑیوں

کو انہوں نے خریدنا اور بیچنا شروع کیا۔ پھر اسے بھی چھوڑ کر وہ کسی کام کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے۔

انکی طبیعت کچھ اس قسم کی تھی کہ جس کام کو بھی وہ ایک مرتبہ چھوڑ دیتے اس کو پھر کبھی نہیں کرتے۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ محرم کے تہوار کے میلے میں اوپر نیچے کا جھولا جھولتے ہوئے وہ جھولے کے ٹوٹ جانے پر نیچے گر پڑے اور ان کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ بمبئی گئے۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد انہوں نے سڑک کے کنارے تھیلا بچھا کر لوہے کا بھنگار خریدنا اور بیچنا شروع کیا۔

دھیرے دھیرے ان کی دکان ایک ٹاٹ سے دو اور دو ٹاٹ سے چار ٹاٹ پر پھیلنے لگی، اور پھر ان کی دکان کی لکڑی کی پیٹی لوہے کی پیٹی میں بدل گئی۔

جب ان کی دکان اس لوہے کی پیٹی میں سمانے نہیں لگی تو انہوں نے دکان کی تلاش شروع کی اور انہیں جلد ہی نگر پالیکا کی بنائی ہوئی دکانوں میں سے ایک دکان بہت ہی کم کرایہ پر مل گئی جو ان کے لیے اچھے دن بہت جلد لے آئی۔

کاروبار کچھ چلا تو ان کی شادی کی بات بھی چل نکلی۔ شادی کیے ہوئے ابھی ایک ہی سال ہوا تھا کہ بچی کو جنم دیتے ہوئے ان کی بیوی بھی چل بسی، اور بچی بھی زندہ نہیں رہ سکی۔ وہ پھر اکیلے کے اکیلے رہ گئے۔ مگر رشتہ داروں نے انہیں زیادہ دنوں تک اکیلا رہنے نہیں دیا۔ ان کے نکاح کی بات پھر چلی۔

ان کے وطن میں تو رشتہ داروں کو کوئی لڑکی پسند نہیں آئی تو وہ شہر کے باہر اچھی عورت کی تلاش میں بھٹکنے لگے، کیوں کہ انہیں عثمان خاں نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ میں اب کسی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔ ڈھونڈنا ہی ہے تو کوئی اچھی سی عورت دیکھو، جو گھر بار سنبھال سکے۔

آخر رشتہ داروں کو ایک عورت پسند آئی ۔ وہ اُس علاقہ کی تھی جس کو شادی بیاہ کی منڈی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا ۔ اس علاقہ میں لوگ اکثر شادی بیاہ کرنے جایا کرتے ہیں اس علاقہ میں شادی کرنے میں کوئی دقت یا پریشانی لوگوں کو نہیں ہوتی ۔ کیوں کہ اس علاقہ میں شادی کرو یا نکاح پڑھاؤ لڑکی یا مطلقہ عورت بآسانی مل جاتی ہے ۔ وہاں کے لوگ اتنے سیدھے سادے اور غریب ہیں کہ وہ بیاہ کے وقت نہ تو لڑکے کی عمر دیکھتے ہیں اور نہ ہی اس کی ذات برادری پوچھتے ہیں ۔ عقائد کی چھان بین کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ گھر بار سے بھی انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا ۔ لڑکا کنوارا ہے یا بال بچوں والا اس سے انہیں غرض نہیں ہوتی ۔ وہ تو بس اپنی بچی کو بیاہ دینا چاہتے ہیں ۔ اس کے لیے ان کی کوئی بڑی فرمائش بھی نہیں ہوتی ۔ چند جوڑے کپڑے، چند سو روپے یا پھر ایک وقت کی اچھی سی دعوت ۔

کئی مرتبہ تو ایسا ہوا کہ عمر دراز لوگ اپنے بیٹے یا کسی رشتہ دار کے لیے لڑکی تلاش کرنے گئے تو اپنے لیے بھی اچھی سی لڑکی تلاش کر کے لے آئے ۔ ایسے کئی قصے مشہور ہیں ۔

وہ بھی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اس علاقے میں گئے اور دوسرے دن نکاح پڑھوا کر بیوی لے آئے ۔

یہ عورت ـــــ جس کا خاوند شادی کے کچھ دنوں کے اندر ہی ایک حادثہ میں ہلاک ہو گیا تھا، انہیں بہت پسند تھی ۔ جیسا نام ویسا ہی حسین سراپا اس کا ۔ چاند اس کا نام تھا اور وہ چاند کے مانند حسین و خوب صورت تھی ۔ عثمان خاں کو وہ عورت اتنی اچھی اور خوب صورت لگی کہ بیان سے باہر ہے ۔

وہ جب پہلی رات کو کمرے میں اکیلے ہوئے اور انہوں نے پہلے پہل اسے دیکھا ـــ تو بے ساختہ ان کے منہ سے نکل گیا ..... تم سچ مچ چاند ہو ۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب اور انہوں نے اسے سینہ سے لگالیا ۔

جب بھی وہ اسے پیار سے بلاتے تو چاند بی بی کہہ کر مخاطب کرتے ۔ چاند کی

یسمیں اور خوش گوار روشنی میں ان کی زندگی بڑی اچھی طرح بسر ہونے لگی۔

لیکن انہیں بہت جلد اس بات کا احساس ہو گیا کہ جس طرح آسمان کے چاند میں داغ ہے اسی طرح ان کا چاند بھی داغدار ہے۔ پہلے خاوند کی موت سے اسے گہن تو پہلے ہی لگ چکا تھا۔ اس پر اس کی چنچل طبیعت نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

انہیں یہ احساس ہونے میں دیر نہیں لگی کہ چاند جو اُن کو بہت عزیز ہے دوسروں کو بھی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ کچھ لوگوں نے انہیں ایسی باتیں بھی بتلائیں، جو کہاسُنی کی حد کی تھیں، لیکن ان باتوں نے ان کا دلی سکون ان سے چھین لیا۔ ان باتوں نے انہیں اتنا مجبور کر دیا کہ سینے پر پتھر رکھ کر وہ چاند کو چھوڑ بیٹھے ...... اور چھوڑے بھی ایسا کہ... طلاق۔ طلاق۔ طلاق!

سبھی رشتہ داروں نے بہت کچھ کہا۔ مگر انہوں نے کسی کی کچھ نہ سُنی، کیوں کہ اب سننے کو کچھ رہ بھی نہیں گیا تھا، کیوں کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

انہوں نے طلاق دینے سے پہلے بہت چاہا کہ وہ اپنے قصور معاف کروالے۔ ایک مرتبہ بھی وہ کہتی کہ میرا قصور معاف کر دیجیے تو وہ دل سے اس کا قصور معاف کر دیتے۔ مگر وہ اپنی طبیعت کی اتنی ہٹیلی اور ضدی تھی کہ اس نے ان سے ایک مرتبہ بھی معافی نہیں مانگی۔ اور انہوں نے غصّہ میں آکر اسے طلاق دے دی۔

وہ جب طلاق کے بعد چلی گئی تو انہیں اس کا خاموش سسکیاں لیتے ہوئے جانا رہ رہ کر یاد آتا رہا۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ:

"بہت پچھتاؤ گے ہم کو یاد کر کے۔"

اور اس کے جانے کے بعد واقعی وہ بہت پچھتائے، تڑپے، روئے، آہ وزاری کی، مگر اب پچھتانے سے حاصل کیا ہو سکتا تھا —؟ یہ پچھتاوا اب دیکھنے اور سننے والا کوئی نہیں تھا۔ جس کے لیے پچھتاوا تھا وہ تو روپیٹ کر اپنے گاؤں چلی گئی تھی۔

زندگی ان پر دو بھر تو ہوگئی تھی، مگر جلد ہی عثمان خان نے جینا سیکھ لیا۔

اس بات کو دس برس کا عرصہ بیت گیا۔ اب ان کی عمر کچھ کم چالیس برس کی ہوگئی تھی۔ اس درمیان انہوں نے اپنے کاروبار کو وسعت دینا شروع کیا۔ کچھ ان کی محنت اور کچھ ان کی قسمت نے ان کا ساتھ دیا۔ کاروبار چل نکلا۔ اور انہوں نے اپنے مکان کا حصّہ اپنے بھائیوں کو دے دیا اور خود نئی کالونی میں ایک اچھا مکان بنا بنایا خرید لیا اور اس میں رہنے لگے۔

زندگی آرام سے بسر ہونے لگی تو نہ جانے وہ کیسے بہکنے لگے۔ انہوں نے دوستوں کی صحبت میں شراب پینی شروع کردی۔ شروع میں تو وہ حد ہی میں رہ کر پیتے تھے، مگر آہستہ آہستہ اس کی مقدار بڑھتی گئی۔ تھوڑی بہت شراب سے ان کا جی نہیں بھرتا اور وہ بے حساب پینے لگے۔ جب کوئی کہنے سننے والا نہیں رہا تو وہ ہر روز آدھی رات گزرنے کے بعد شراب کے نشے میں گھر آنے لگے۔

ایک دن وہ شام کے وقت اپنی دکان سے گھر آرہے تھے تو ان کا ایک بہت ہی جگری دوست انہیں راستے میں مل گیا اور وہ اس کے کہنے پر اس کے ساتھ ایک بہت ہی اچھی اور نئی جگہ پینے کے لیے چلے گئے۔

انہیں نہیں معلوم کہ ان کا دوست انہیں شہر کے کس حصّے میں لے گیا، کیوں کہ وہ انہیں بس میں بٹھا کر لے گیا تھا۔ ان کا دوست شہر میں چلنے والی بس میں ملازم تھا۔ اس میں کہیں آنے جانے کے لیے انہیں کوئی کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا۔ چوراہے سے انہوں نے جو بھی بس ملی اسے پکڑا۔ اور رات کے اندھیرے میں بس کس طرف چلی انہیں اس کا اندازہ نہیں ہوا۔ وہ تو بس نئی جگہ اور نئی چیز پینے کے خیال میں مست تھے۔ اور کچھ ان کے دوست نے انہیں اپنی دل موہ لینے والی باتوں میں ایسا الجھایا کہ وہ جان بھی نہ پائے کہ وہ کہاں جارہے ہیں۔

جس جگہ وہ رات کے اندھیرے میں گئے وہ جگہ واقعی بہت اچھی تھی۔ انہوں نے

اس گھر میں بیٹھ کر جو شراب پی وہ بھی واقعی بہت مزے دار تھی۔ دونوں ہی چیزوں کی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی ـــــ شراب ـــــ جس کی تعریف بڑے سے بڑا مے خوار نہیں کر سکا پھر وہ کیا کرتے ـــــ جو آتی گئی وہ واہ واہ کرتے کرتے پیتے گئے۔

وہ مکان کسی عیسائی مذہب کے ماننے والے کا تھا۔ کمرہ بہت صاف ستھرا، اور کشادہ تھا۔ ہر چیز اپنے قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں اور جتنے لوگ شغل کر رہے تھے وہ بھی بڑے مہذب اور شائستہ دکھائی دیے۔

مالکِ مکان کی شرافت، ملنساری اور بات چیت سے بھی عثمان خاں بہت خوش ہوئے ـــ مگر اس گھر میں آ کر وہ جتنے خوش ہوئے تھے، وہیں یہ جان کر بہت دکھی ہوئے کہ مالک مکان کے ایک پیر میں فیل پا تھا۔

عثمان خاں نے شراب سے بھری شیشی اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لی اور وہ ان لوگوں کے ساتھ پیچھے چلنے لگے جو اس گھر سے نکل کر گلی میں چلنے لگے تھے۔

کچھ دیر کے بعد انہیں اطمینان ضرور حاصل ہوا۔ لیکن یہ احساس ہوتے ہی انہیں گھبراہٹ ہونے لگی کہ ان کے ساتھ چلنے والا شخص ان کا وہ دوست نہیں ہے جو انہیں یہاں تک لایا تھا۔

ایک جگہ وہ رُک گئے اور سوچنے لگے کہ کس طرف جائیں؟

جیسے جیسے انہیں یہ احساس ہونے لگا کہ وہ بہت زیادہ شراب پیے ہوئے ہیں، اور ان کی جیب میں بہت سارے روپے ہیں تو ان کی گھبراہٹ اپنی حد کو پہنچ گئی۔

"کوئی ان سے یہ روپے چھین بھی سکتا ہے، پولس کے ہاتھ لگ جانے پر انہیں حوالات میں بند بھی کیا جا سکتا ہے ـــ اور ـــ اور ـــ کوئی بدمعاش ان روپیوں کی خاطر ان کی جان بھی لے سکتا ہے۔"

یہ خیال آتے ہی اس جگہ کھڑے رہنا ان کے لیے دوبھر ہو گیا، اور پھر وہ بغیر

سوچے سمجھے تیزی سے چلنے لگے۔ اس گلی سے اس گلی میں ـــ مگر انہیں صحیح راستہ نہیں مل رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں؟ اور کس طرف جائیں؟ مگر وہ رُکے بغیر چلے ہی جارہے تھے۔

خدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ وہ جیسے ہی گلی کے نکڑ پر آئے تو انہیں سامنے تیز روشنی نظر آئی۔ انہوں نے رک کر اطمینان کی سانس لی۔ سامنے سڑک کا چوراہا تھا جہاں پر دکانیں کھلی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

یہیں ـــ ان سے ایک ایسی غلطی ہوگئی جس نے ان کی زندگی کو ایک عجیب موڑ دیا۔ یہاں کھڑے ہوتے ہی ان کے جی میں کیا آئی کہ انہوں نے پتلون کی جیب سے شراب کی شیشی نکالی اور منہ سے لگالی۔ کتنی شراب پی اس کا انہیں اندازہ نہیں ہُوا۔ اس سے ان کی جان میں جان تو آئی مگر کچھ لمحوں بعد ہی ان پر نشہ سا طاری ہونے لگا، اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے سڑک پر آگئے۔

سامنے ٹیکسی سے ایک مرد اور ایک عورت اُتر رہے تھے ـــ اتنا انہوں نے دُور سے دیکھا۔ کافی دیر سے سنبھالا ہُوا ہوش ان کا ساتھ چھوڑنے لگا اور انہوں نے چاہا کہ وہ جلد سے جلد چل کر بجلی کے کھمبے تلے پہنچ جائیں جہاں وہ ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ پر ٹیکسی تک پہنچتے پہنچتے وہ آپے میں نہیں رہے۔ وہ زمین پر گر کر ڈھیر ہوگئے۔ پھر انہیں نہیں معلوم کہ کیا ہوا؛ کیونکہ وہ سُدھ بُدھ کھو چکے تھے۔

جب وہ رات کے پچھلے پہر اپنے ہوش میں آئے تو وہ اپنے گھر میں بستر پر پڑے ہوئے تھے ـــ وہ تو وہاں زمین پر گر رہے تھے پھر وہ اپنے گھر میں اپنے بستر پر کیسے پہنچ گئے؟ ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ ذہن پر زور دینے پر انہیں صرف اتنا یاد آیا ـــ کہ ٹیکسی سے ایک مرد اور ایک عورت اُترے تھے۔ پھر بھی وہ اپنے بستر پر پڑے ہوئے سوچ رہے تھے کہ جس نے بھی انہیں گھر لاکر چھوڑا وہ کسی فرشتے سے کم نہیں ہوگا۔

وہ کچھ دنوں تک شرمندہ شرمندہ سے رہے۔ اور عہد کیا کہ اب کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ مگر وہ کسی نے کہا ہے نا "چھٹتی نہیں ہے یہ کافر منہ سے لگی ہوئی"۔ وہ پھر شراب پینے لگے۔

پھر ایک دن عجیب بات ہوگئی۔ ایک شام وہ شغل کر کے واپس آرہے تھے تو بس میں چڑھتے ہوئے ان کا توازن کچھ بگڑ سا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ بس سے گر جائیں، انہیں کسی نے پیچھے سے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا:

"سنبھل کر چڑھیے!"

کسی کی نسوانی آواز پر وہ چونک سے گئے۔ انہیں کچھ زیادہ نشہ نہیں تھا، اس لیے انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک برقعہ پوش خاتون انہیں سنبھالے ہوئے تھی۔

انہیں تعجب تو بہت ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے ــــ کہ اس خاتون نے انہیں مخاطب کر کے کہا:

"چلیے بس چلنے والی ہے۔"

اور وہ سنبھلے ہوئے بس میں سوار ہو گئے۔ ان کے پیچھے وہ برقعہ پوش خاتون بھی بس میں سوار ہو گئی۔

"بیٹھیے!" ایک خالی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس خاتون نے ان سے کہا۔ اور وہ خاموشی کے ساتھ اس خاتون کے پاس سیٹ پر بیٹھ گئے۔

وہ اتنے سحر زدہ ہو گئے تھے کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ خاتون کون ہے؟ جو اُن سے اپنوں جیسا سلوک کر رہی ہے۔

اس خاتون کی آواز انہیں کچھ پہچانی ہوئی سی لگی۔ مگر یہ آواز کس کی ہے؟ ابھی وہ اچھی طرح سوچ بھی نہیں پائے کہ بس کے رفتار پکڑتے ہی اس خاتون نے اپنے چہرے کا نقاب اُلٹ دیا۔ بس ایسا لگا جیسے گہری اندھیری رات میں چاند نکل آیا ہو ــــ یہ وہ چاند تھی

ان کی دوسری بیوی ــــ جس کو بہت دن ہوئے وہ طلاق دے چکے تھے۔

وہ دم بخود اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

"ادھر سرک کر بیٹھیے، ورنہ آپ گر جائیں گے۔" چاندنی بی ان سے کہہ رہی تھی۔ وہ کچھ اور سرک کر اس کے نزدیک ہو گئے ــــ لیکن کچھ بولے نہیں۔ ساکت حالت میں خاموش بیٹھے رہے۔

"چلیے ــــ" کی آواز پر وہ چونک سے گئے۔ چاندنی بی انہیں سیٹ سے اٹھنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ اٹھے اور خاموشی کے ساتھ بس سے اُتر گئے۔

جب وہ چلنے لگے تو انہیں بہت جلد احساس ہو گیا کہ چاندنی بی ان کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے ــــ ایک جگہ رک کر چاندنی بی نے جاتی ہوئی رکشا کو رکوا لیا، اور انہیں روک کر اس میں بٹھایا اور خود بھی رکشا میں بیٹھ کر رکشا والے سے کہا:

"پرکاش ٹاکیز کے آگے۔ نئی کالونی میں۔ اسکول کے پاس لے چلو۔"

جب وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچے تو چاندنی بی نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

"چلیے اُتریے!"

وہ رکشا سے اُترے۔ چاندنی بی نے رکشا والے کو کرایہ دیا اور وہ ان کے ساتھ چلتی ہوئی ان کے گھر میں آ گئی۔ اس رات باتوں باتوں میں انہیں معلوم ہوا کہ چاندنی بی کو ان کے گھر کا پتہ پہلے سے معلوم تھا۔ اور وہی اپنے ساتھ میں انہیں اس رات بس گھر تک لائی تھی جس رات وہ بے سدھ ہو کر گر پڑے تھے۔

وہ شرمندہ سے مسہری پر بیٹھے تھے ــــ اور چاندنی بی سامنے صوفے پر بیٹھی تھی ــــ

"آپ کب سے پینے لگے ہیں؟" اس نے پوچھا۔ "آپ کیوں اتنی پیتے ہیں کہ آپ کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا؟ اگر آپ ساری رات اس جگہ پڑے رہتے ــــ تو ــــ؟"

وہ خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ بولے نہیں۔ بولنے کے لیے ان کے پاس رہ ہی کیا گیا تھا؟

"تم نے پھر شادی کیوں نہیں کی؟" چاندنی بی نے بے باکی کے ساتھ سوال کیا۔

"ہوں — !" عثمان خاں کچھ مسکرائے — "چھوڑو اس قصّہ کو — اب میں شادی کر کے کیا سکھ پاؤں گا؟ اب تو کچھ اور ہی تلخی مجھے راس آنے لگی ہے۔"

وہ اس سے زیادہ کچھ اور کہہ پاتے کہ سُر درد ان پر بری طرح حاوی ہونے لگا اور وہ مسہری پر لیٹ کر نیند کی گہری وادیوں میں کھو سے گئے۔

جب انہیں ہوش آیا تو انہیں یہ جان کر بے انتہا حیرت ہوئی کہ وہ ایک ڈاکٹر کے نرسنگ ہوم میں بیمار پڑے ہوئے ہیں، اور چاندنی بی ان کی تیمارداری میں لگی ہوئی ہے۔

جب ڈاکٹر صاحب آئے تو انہوں نے انہیں بتایا کہ تین دن پہلے — اس رات جس رات وہ چاندنی بی سے باتیں کرتے کرتے نشہ کی حالت میں مسہری پر لیٹ کر گہری نیند میں سو گئے تھے اس رات صبح ہوتے ہوتے ان پر دل کا سخت دورہ پڑا تھا۔ اور چاندنی بی نے جیسے تیسے انہیں نرسنگ ہوم تک لایا تھا — اور تبھی سے وہ زندگی اور موت کے درمیان جھولتے ہوئے سانسیں لے رہے تھے۔

اور جب ایک دن ڈاکٹر نے چاندنی بی کے پوچھنے پر انہیں بتلایا کہ یہ اب خطرے سے باہر ہیں، تو وہ ان کے سرہانے کھڑے کھڑے رو پڑی تھی۔

اور اس وقت عثمان خاں کے لیے کچھ کہنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان کی آواز جیسے گلے میں ہی اٹک گئی تھی۔

جب وہ کچھ دن بعد ٹھیک ہو کر چاندنی بی کے ساتھ اس نرسنگ ہوم سے گھر واپس آئے تو ان کے بہت روکنے کے باوجود چاندنی بی نہیں رکی۔

"میں مجبور ہوں" چاندنی بی نے کہا۔ "میں دوسرے کی ہو چکی ہوں۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔"

اور جب عثمان خاں نے اس کا اتا پتہ پوچھنا چاہا، تو وہ یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی :

"اب پتہ پوچھ کر کیا کرو گے؟"

اس کے چلے جانے کے بعد عثمان خاں بہت دیر تک اس کے خیال میں مگن رہے، ـــ اب وہ کب آئے گی؟ ـــ وہ مسہری پر اکیلے پڑے ہوئے سوچتے رہے ـــ آئے گی بھی یا نہیں؟

ان کا سر درد کچھ کم ہوا تو وہ ماضی کی وادیوں سے نکل آئے۔ انہیں اپنا نشہ کچھ کم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

کافی کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ کھانا کھا لیا جائے یا نہیں، وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے۔ انہیں کچھ تشنگی محسوس ہوئی۔ وہ مسہری سے اٹھ کر میز تک آئے۔ انہوں نے شراب کی بوتل سے گلاس میں شراب انڈیلی اور اس میں پانی ملا کر جلدی سے پی لی۔

انہیں بڑی راحت محسوس ہوئی۔ وہ جب دوبارہ مسہری پر آ کر لیٹے تو ـــ کیا وہ آئے گی؟ یہ خیال انہیں پھر ستانے لگا۔ مگر وہ نشہ کے گن تارے میں سونے لگے۔

مگر اس رات ـــ جس رات چاند بی بی نے مجھے پہلی مرتبہ بے سدھی کی حالت میں گھر پہنچایا تھا اس کے ساتھ کون تھا؟ کیا وہ اس کا خاوند تھا؟ نہیں وہ اس کا خاوند نہیں ہو سکتا ـــ ایک غیر شخص کو ـــ اپنے خاوند کے ساتھ کوئی عورت ـــ ان کے گھر تک آدھی رات کو کیسے پہنچانے آ سکتی ہے؟ ـــ پھر وہ اس رات میں کس مرد کے ساتھ کہاں سے آ رہی تھی ـــ؟ اور وہ مرد کوئی غیر تو نہیں تھا جس کے ساتھ وہ اس رات موج مستی کے لیے نکلی تھی!

دوسری مرتبہ بھی جب وہ انہیں ملی تھی تو اس وقت بھی رات ہی تھی ـــ وہ رات ہی میں گھر سے کیوں نکلتی ہے؟ اگر وہ شادی شدہ ہے تو پھر اس کے شوہر نے اس کو اتنی

آزادی کیوں دے رکھی ہے؟ وہ کتنی بے باک ہو گئی ہے جیسے دو آتشہ شراب ۔ کتنی اچھی لگنے لگی ہے اب وہ ۔۔۔ ! اس کا بناؤ سنگھار ۔۔۔ کبھی ساڑی ۔ کبھی کرتا شلوار

یہ سب کیا ہے ۔۔۔؟!!!

تو کیا اب وہ باقاعدہ عیشیہ کرنے لگی ہے؟

اس آخری خیال نے انہیں بہت زیادہ بے چین کر دیا ۔ وہ اتنے زیادہ بے چین ہو گئے کہ مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گئے ۔ دل میں اٹھنے والی ہوک کو دبانے کے لیے انہوں نے بے تحاشہ تکیہ اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا ۔ ابھی انہیں ایسا بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ یکایک ان کے کانوں میں وہی جانی پہچانی آواز سنائی دی، جو چاندنی بی کی تھی ۔

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں ۔۔۔؟"

وہ ان کے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی ۔

انہوں نے نظریں اٹھا کر چاندنی بی کو دیکھا ۔

"جب آ ہی چکی ہو تو اجازت کی ضرورت کیا ہے؟" عثمان خاں، نے آہستہ سے کہا ۔

اور چاندنی بی آ کر کمرے میں صوفے پر بیٹھ گئی ۔

"شکر ہے کہ آپ کچھ اپنے آپ میں ہیں!"

عثمان خاں کے ذہن میں یہ خیال بڑی طرح چکر لگا رہا تھا کہ وہ کیا ان گئی ہے اس لیے انہوں نے چاندنی بی کی بات کا کوئی سیدھا جواب نہ دیتے ہوئے اپنے طور پر چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا :

"میں تو اپنے آپ میں ہوں ۔ تم اپنی کہو، تم اپنے آپ میں ہو یا نہیں؟"

لہجے کی کاٹ نے چاندنی بی کو مبہوت کر دیا ۔ وہ خاموش رہی تو عثمان خاں نے تلخی بھرے انداز میں اس سے دریافت کیا :

"تم غیر مردوں کے ساتھ رات میں اپنے گھر سے کیوں نکلتی ہو؟"

چاند بی بی نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ تو وہ خود کہنے لگے:

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم راتوں کو گھر سے کیوں نکلتی ہو؟ اور تمہارے ساتھ اس رات میں کون مرد تھا؟ ___ وہ تمہارا کوئی رشتہ دار نہیں تھا ___ مجھے صاف صاف بتا دو ___ کہ میں جو کچھ سمجھ رہا ہوں وہ ٹھیک ہے۔"

"جب تم سمجھ ہی چکے ہو تو پھر پوچھنے سے فائدہ کیا ہے؟" اتنا کہہ کر چاند بی بی نے گردن جھکالی۔

اس جواب پر اب کے عثمان خاں دم بخود رہ گئے۔ وہ ایسے ہی بیٹھے چاند بی بی کو دیکھتے رہ گئے۔ جیسا جواب سے پہلے دیکھ رہے تھے ___ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کے تن سے جان نکل گئی ہو۔ کچھ دیر چاند بی بی کو گھورتے رہنے کے بعد انہوں نے پھر اپنے گھٹنوں میں سر دے دلیے۔

"ہاں میں وہ بن گئی ہوں" وہ کہہ رہی تھی" جو تم نے سوچا ہے تم نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔ پر میں کرتی کیا؟ تم نے مجھے طلاق دے دی جو تمہارا حق تھا۔ پر میں نے تم سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ تم نے مجھے طلاق کیوں دی؟ کیا خوب صورت ہونا کوئی گناہ ہے؟ مجھے خدا نے ایسا بنایا ہے تو میں کیا کروں؟ لیکن کیا کسی میں عیب ہونا اسے طلاق دینے کی وجہ بن سکتی ہے؟ تم میں بھی کوئی عیب ہے یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا۔

سانس لینے کے لیے چند لمحے وہ رکی۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا:

"تم ہی تو کہتے تھے نا کہ میں ایسی ہوں جیسے قوس قزح رنگوں سے بنی ہوئی ہوں میں۔ کتنے عہد و پیماں کیے تھے تم نے ساتھ نبھانے کے لیے؟ کیا تم نے نبھایا؟

تم نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے عدت پوری کی۔ میرا پھر نکاح ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد میرے اس شوہر نے اپنی پہلی بیوی کے کہنے پر مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے پھر ایک مرتبہ

عدّت کے دن جیسے تیسے گزارے۔ ماں باپ غریب تھے، مجھے کب تک بٹھائے کھلاتے؟ تیسرے کے سپرد کر دیا۔ جس نے مجھے اس راستے پر لگا دیا۔ پھر مجھے وہ دنیا میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ کر اس دنیا سے چلا گیا۔ اب میں عدت کے دن گزارتے گزارتے بے حال ہو گئی تھی۔ گاؤں بھی جا نہیں سکتی تھی۔ اس لیے میں اسی راستے پر چلنے لگی۔ جس پر مجھے لا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔

وہ آنسو بہاتی جا رہی تھی اور کہتی جا رہی تھی۔ اس کے آنسو تھے کہ تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔

وہ کبھی سر جھکائے بیٹھے رہے اور کبھی گردن اٹھا کر اسے دیکھتے رہے۔ ان کے سارے بدن کی طاقت جیسے سلب ہو چکی تھی۔

جب اور زیادہ ایسے ہی بیٹھے رہنا ان کے لیے مشکل ہو گیا تو وہ مسہری سے اٹھے، میز تک گئے اور پھر انہوں نے شراب کی بوتل سے گلاس میں شراب انڈیلی اور جتنی جلدی ہو سکا گلاس خالی کر دیا۔ جب وہ گلاس میز پر رکھ کر مسہری کی طرف پلٹ رہے تھے تو انہوں نے سنا کہ چاندنی بی کچھ کہہ رہی ہے جسے وہ سمجھ نہ سکے۔

چاندنی بی پر نظر پڑتے ہی ان کے دل میں آیا کہ وہ چلا کر کہیں: "نکل جاؤ میرے گھر سے۔" لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکے۔

چاندنی بی کہہ رہی تھی:

"تمہیں برا کیوں لگا ہے؟ میں تمہاری کیا لگتی ہوں؟"

اتنا سنتے ہی عثمان خاں کے قدم رک سے گئے۔ اور انہوں نے چاندنی بی کی طرف بڑھتے ہوئے ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر جڑ دیا۔

"حرام زادی ــ" وہ چلائے ــ "میں تمہارا کچھ نہیں لگتا ہوں پھر تم یہاں کس لیے آئی ہو؟"

طمانچہ کھا کر چاندنی بی سکتہ میں آ گئی۔ اس نے ایک مرتبہ عثمان خاں کو دیکھا،

اور پھر وہ گردن ہاتھوں میں لے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

چاندنی بی کے اس طرح رونے نے انہیں پگھلا کر رکھ دیا۔ انہیں ایسا لگا، کہ چاندنی بی نرسنگ ہوم میں ان کے سرہانے کھڑی ہوئی رو رہی ہے۔

چاندنی بی نے سر جھکائے ہی کہا:

"جب میں نے تم کو ..... کئی دِنوں بعد .... اِس حالت میں دیکھا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔"

وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہہ رہی تھی:

"میں سب کچھ بھول کر تمہارے گھر آئی ـــ اتنا قصور ہُوا۔ معاف کر دو۔"

اور عثمان خاں کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"قصور تمہارا نہیں ـــ" عثمان خاں نے جب اسے معافی مانگتے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولے "ـــ میرا ہے، جو میں نے تم کو طلاق دے دی یہ سمجھ کر کہ میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تم سے دامن چھڑا لیا۔ لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ سچّی شادی طلاقوں سے نہیں توڑی جا سکتی۔ یہ تو جنم جنم کا ساتھ ہوتا ہے۔ جسموں کے فانی ہو جانے کے بعد بھی یہ رشتہ قائم رہتا ہے۔"

وہ نشہ کی حالت میں کیا کہہ رہے تھے خود ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر میز کی طرف گئے۔ انہوں نے پھر گلاس تیار کیا اور اسے ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ جیسے تیسے وہ مسہری تک مُڑ گئے۔

کچھ دیر یوں ہی بیٹھے سوچنے کے بعد ..... انہوں نے چاندنی بی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"آؤ چاندنی بی! پھر ہم دوبارہ آپس میں شادی کر لیں۔"

اور اس سے پہلے کہ چاندنی بی اٹھ کر ان تک پہنچتی، وہ مسہری پر بے سُدھ

ہوکر لڑھک گئے۔

مسہری کے نزدیک جا کر چاند بی بی نے انہیں ٹھیک سے مسہری پر لٹایا، اور مکان کا باہری دروازہ بند کر دیا۔ کمرے میں واپس آ کر اس نے بتی گُل کر دی اور مسہری پر ان کے بازو میں نئی نویلی دُلہن کی طرح سمٹی سمٹائی لیٹ گئی۔

اور باہر — آسمان کا چودھویں کا چاند بڑھ کر گھرے بادلوں کی آغوش میں سما رہا تھا۔

••

برات

عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد مولانا حامد علی خاں مسجد سے گھر تک کتنے تھکے تھکے سے آئے یہ کچھ ان کا دل ہی جانتا ہے۔ یہ ان کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ بہت زیادہ فکر مند ہیں۔ یہ سوال انہیں پریشان کیے ہوئے تھا کہ اگر حاجی صاحب نے برات واپس کر دی تو کیا ہوگا؟ کتنی بدنامی ہوگی! سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ دوستی الگ دشمنی میں بدل جائے گی۔ اب وہ کیا کریں؟

کس طرح برات کو واپس ہونے سے روکا جائے؟

سوچ سوچ کر ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی طرح ان کے دل و دماغ کو سکون نہیں مل رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں کبھی اتنے پریشان نہیں ہوئے تھے۔

کچھ دیر انہوں نے اپنی دل پسند کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تاکہ کچھ تو سکون ملے، مگر سکون تو آج جیسے ان سے کوسوں دور تھا۔ کمرے میں ٹہلنے کے بجائے انہوں نے تپائی سے جانماز اٹھائی اور اس کو بچھا کر بیٹھ گئے، پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی:

"اے میرے معبود! آج ہم ایک بڑی آزمائش میں گھر گئے ہیں، اور ہمارے لیے فیصلہ کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے کہ ہم کیا کریں؟ اور کیا نہ کریں؟ ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ تو ہی ہمیں صحیح راستہ دکھلانے والا ہے۔ حاجی صاحب اپنی ضد پر قائم ہیں۔ اس صورت میں میرے بیٹے کی شادی ہونا مشکل ہے۔ ہمیں اپنے محبوبؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین"

کل ان کے گھر میں ان کے بیٹے کی شادی ہونے والی تھی، جس میں شریک ہونے

کے لیے دُور دُور سے مہمان آئے تھے۔ آج ان کے ہاں سے دُلہے کے کپڑے دُلہن کے ہاں جانے والے تھے اور وہاں سے مہندی آنا تھی۔ اس لیے گھر میں رشتہ دار اور آس پڑوس کی عورتیں کافی تعداد میں جمع تھیں۔ گھر کے بڑے ہال سے ان سب کی زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

مگر ان سے بے نیاز مولانا صاحب اپنے خیالات میں گُم تھے۔ کچھ دیر بعد ان کی بیگم کمرے میں آئیں اور ان کو آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹے دیکھا تو کہنے لگیں:

"شام ہو رہی ہے، لڑکیاں دولہے کے کپڑے لے کر دلہن کے ہاں جا رہی ہیں آپ چل کر ایک نظر دولہے کے کپڑے دیکھ تو لیجیے۔"

"اچھا۔" مولانا صاحب اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئے اور دریافت کیا "کیا حاجی صاحب کے گھر سے کوئی آیا تھا؟"

"نہیں۔" بیگم صاحبہ نے مختصر سا جواب دیا۔

"اچھا چلو میں آتا ہوں" مولانا صاحب نے کہا۔

وہ پلنگ سے اُترے اور باز و کے بڑے کمرے میں گئے۔ ایک نظر دولہے کے کپڑے کو دیکھا اور زیادہ دیر رُکے بغیر کمرے میں آ کر لیٹ گئے۔

مولانا چاہتے تھے کہ ان کے چھوٹے بیٹے محمد امین کی شادی کسی ہنگامے کے بغیر بہ حُسن و خوبی انجام پا جائے۔ یہ شادی ان کے عزیز ترین دوست حاجی عظمت اللہ کی لڑکی کشور جہاں سے ہو رہی تھی جو اُن کو بے حد پسند تھی۔

یہ شادی چوں کہ شہر کے دو ممتاز گھرانوں کے لڑکے اور لڑکی کے درمیان ہو رہی تھی، اِس لیے شہر میں اس کا چرچا تھا۔ شروع شروع میں اس رشتے کو دونوں گھرانوں کے خیر خواہوں نے کچھ پسند کیا تھا، مگر مولانا اور حاجی صاحب کے اٹل فیصلے کے سامنے کسی کی ایک نہ چلی اور شادی کی تاریخ طے ہو کر رہی۔

مولانا حامد علی خاں اور حاجی عظمت اللہ حالاں کہ مسلمانوں کے الگ الگ فرقوں سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کی دوستی بہت پرانی تھی۔ دونوں ہی شہر کے مانے ہوئے بزرگ تھے، شخصیت وکردار میں بھی، حیثیت اور اثر ورسوخ میں بھی، اور دینی تعلیم میں بھی کوئی ایک دوسرے سے چھوٹا یا بڑا نہیں تھا۔ دونوں کا ہی شمار شہر کی بزرگ ہستیوں میں ہوتا تھا۔ دونوں ہی دین ومذہب کی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ، متقی، پرہیز گار، روزہ نماز کے بے حد پابند اور بااصول انسان تھے۔

یوں تو دونوں بزرگوں میں دوستی بہت پرانی تھی، پھر بھی اس میں اضافہ تب ہوا جب سے دونوں بزرگوں نے دینی اور سماجی کاموں میں حصّہ لینا شروع کیا۔ دن رات کے ساتھ نے ان میں خیالات کی یکسانیت پیدا کی اور خیالات کی یکسانیت نے گہری دوستی کا روپ اختیار کیا۔

ان دونوں بزرگوں میں رفاقت اس وقت اور بڑھ گئی جب شہر کے نوجوانوں نے ان دونوں بزرگوں کو اپنی تحریک کا رہنما تسلیم کر لیا جو سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف چلائی جا رہی تھی۔

شاہ بانو کے کیس میں جو فیصلہ سپریم کورٹ نے دیا تھا اس نے ملک کے مسلمانوں میں غم وغصّے کی زبردست لہر پیدا کر دی تھی۔ جس نے بعد میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جب یہ تحریک شہر میں شروع کی گئی تو دونوں بزرگوں کی دینی حیثیت کے پیشِ نظر سب نے دونوں کو اپنا سرپرست مان لیا۔

مسلم پرسنل لا میں کسی قسم کی مداخلت دونوں بزرگوں کو سخت ناپسند تھی۔ دونوں کا یہ کہنا تھا کہ مذہب نے جو حقوق دیے ہیں ان کو چھیننے کا حق کسی کو بھی نہیں، کسی بھی قسم کی مداخلت ناقابلِ برداشت ہے۔ انہی خیالات کی بنا پر وہ شہر میں چلائی جانے والی تحریک میں نہ صرف شریک ہوئے تھے بلکہ اس تحریک کے صحیح معنوں میں کرتا دھرتا بن گئے تھے،

اس تحریک سے جہاں ان کی دوستی میں اضافہ ہُوا تھا وہیں مسلمانوں میں ان کی قدر و قیمت بڑھی تھی۔ دونوں بزرگوں کو یہ تحریک اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی ۔ مگر مسلم پرسنل لاء کے تعلق سے جس سوال نے ملک کے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا وہی سوال ان کے بیٹے محمد امین کی شادی کے وقت اُبھر کر سامنے آئے گا۔ یہ مولانا صاحب نے اپنے خواب میں بھی نہ سوچا تھا ۔ یہی وہ سوال تھا جس نے انہیں تحریک میں شامل ہونے پر آمادہ کیا تھا۔ اب یہی سوال اس روپ میں آکھڑا ہوا تھا کہ اسے طے کیے بغیر شادی ممکن نہیں رہی تھی۔

مسلم پرسنل لاء میں کسی کو مداخلت کا حق نہیں ۔ اس نے کبھی انہیں قریب تر کیا تھا اور اب یہی بات ان کے سامنے ایک دوسرے روپ میں موجود تھی۔

حاجی صاحب نے کہا تھا کہ شادی کے بعد محمد امین دوسرا نکاح تو نہیں کرے گا؟ اور اگر اس نے ایسا کیا تو میری بیٹی کا کیا ہوگا؟ کیا وہ بھی ان بے شمار مسلم لڑکیوں کی طرح در بدر کی ٹھوکریں کھائے گی؟ جنہیں ان کے خاوند چھوڑ دیتے ہیں۔ اور پھر میری بیٹی سے پیدا ہونے والی اولادوں کا کیا ہوگا؟ کیا وہ بھی بے یار و مددگار نہیں ہو جائیں گی؟ ایسی صورت میں میری مجبور و لاچار بیٹی کیا کرے گی؟ اس لیے بارات و نکاح سے پہلے یہ طے ہو جانا چاہیے کہ محمد امین شادی کے بعد دوسرا نکاح نہیں کرے گا۔ اور اگر وہ دوسرا نکاح کرے گا تو پھر میری بیٹی کشور کو الگ رہنے اور نان و نفقہ پانے کا حق ہوگا ـــــ اور اس شرط کو وہ باقاعدہ تحریری رُوپ دینا چاہتے تھے۔

برعکس اس کے مولانا کی یہ دلیل تھی کہ اوّل تو امین دوسرا نکاح نہیں کرے گا اور اگر ایسا کرے گا تو وہ اپنے اس حق کے مطابق کرے گا جو اسے پرسنل لاء کی وجہ سے حاصل ہے اور یہ حق مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے اس لیے اسے چھیننے کا حق کسی کو نہیں ۔ دوسرے شادی سے پہلے اس بات کا یقین کون دلائے گا کہ وہ دوسرا نکاح نہیں کرے گا۔ بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ شادی کے بعد دُوسرا نکاح کرے گا تو وہ کیا غلط کرے گا؟ کیا اسے مسلم

پرسنل لاء نے دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں دی ہے ؟ اگر اس پر شادی سے پہلے روک لگائی گئی تو یہ مذہب کی سراسر خلاف ورزی ہوگی ۔ اس سلسلے میں جو بھی اقرار نامہ لکھا جائے گا وہ مسلم پرسنل لاء کے خلاف ہوگا ۔ اس سے شادی کے بعد الجھنیں کم نہیں ہوں گی بلکہ بڑھیں گی، اس لیے یہ سوال قبل از وقت ہے ۔

مولانا کی یہ باتیں ماننے سے حاجی صاحب کو تامل ہے ۔ ان کا اصرار تھا کہ دوسرے نکاح سے متعلق لکھا جانے والا اقرار نامہ کسی لحاظ سے بھی ہمارے مذہبی اصولوں کے خلاف نہیں،

وہ اپنی بات دہراتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی لڑکی کی شادی کے وقت یہ باتیں پہلے سے طے کرلینا چاہئیں ۔ جب آپ اپنے بیٹے کے ذاتی معاملات میں دخل دینا پسند نہیں کرتے ہیں تو پھر مجھے اس لڑکے کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کرنے کی اجازت دینے کا کیا حق ہے ؟ جس کے والدین شادی سے پہلے مجھے یہ یقین نہ دلا سکیں کہ شادی کے بعد ان کا لڑکا دوسرا نکاح کرے گا، تو لڑکی کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ اپنے خاوند سے گزارہ بھتہ حاصل کرلے ۔ اس لیے بارات اور نکاح سے پہلے یہ باتیں طے کرلینا چاہئیں ۔ ورنہ شادی کے بعد بہت سے جھگڑے ہوں گے لعنت طلاق تک پہنچے گی جو مزید جھگڑوں کو جنم دے گی ۔

اس معاملے میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب یہی سوال دوبارہ مولانا صاحب اور حاجی صاحب کے درمیان بحث کا موضوع بنا ۔

آج دوپہر میں مولانا صاحب حاجی صاحب کے یہاں کھانے پر مدعو تھے ۔ جس کمرے میں وہ کھانا کھا رہے تھے وہاں کوئی اور موجود نہیں تھا ۔

یکایک حاجی صاحب نے یہ سوال پھر دُہرایا ۔ اور مولانا صاحب سے غور کرنے کی درخواست کی ۔

مولانا نے حاجی صاحب کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس سلسلے میں تمام اندیشے بے بنیاد ہیں ۔ مگر یہ سوال جیسے حاجی صاحب کی دل کی گہرائی میں اُتر گیا تھا ۔ وہ اپنی بات پر

اَڑے رہے ۔ ایک مرتبہ پھر مولانا نے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس بات پر غور کرنا نہ صرف بے محل ہوگا بلکہ قبل از وقت بھی ہوگا، دوسرے یہ کہ میرے بیٹے کا یہ سراسر ذاتی معاملہ ہے مَیں اس میں کیا کرسکتا ہوں؟ اگر کچھ کروں تو وہ میرے بیٹے کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کے مترادف ہوگا، جو میرے لیے مناسب نہیں۔

حاجی صاحب نے اپنی بات پر پھر زور دیتے ہوئے کہا:

"یہ بات ہمارے اصولوں کے عین مطابق ہے۔"

مولانا صاحب نے دریافت کیا:

"کیسے یہ ہمارے اصولوں کے مطابق ہے؟"

"جیسے ــ" حاجی صاحب نے جواب دیا "جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کی زندگی میں حضرت علی کو دوسرے نکاح کی اجازت نہیں دی تھی۔"

"ہاں اجازت نہیں دی تھی ــ" مولانا صاحب بولے "یہ بات صحیح ہے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تو نہیں فرمایا تھا کہ تم دوسرا نکاح زندگی میں کبھی نہ کرنا! تم بھی باپ ہو ــ تم بھی میرے بیٹے کو دوسرے نکاح کی اجازت نہ دینا۔ لیکن تمہیں اس کے دوسرے نکاح کرنے کے حق کو اس سے چھیننے کا کوئی اختیار نہیں۔ اِس لیے خدارا کوئی ایسی بات نہ کرو، جو ہمارے مذہب کے خلاف بھی ہو اور میرے لیے ناقابلِ قبول بھی۔"

یہ بات کہتے کہتے مولانا صاحب نہ جانے آتنا اور کیسے کہہ گئے:

"اگر آپ نہیں چاہیں گے تو ہم برات لے کر نہیں آئیں گے۔"

یہ بات حاجی صاحب کو ناگوار گزری اور وہ بھی طیش میں یہ کہہ بیٹھے:

"کیا براتیں واپس نہیں ہوتیں؟ اگر برات آ بھی گئی تو واپس کر دی جائے گی۔"

اس پر مولانا صاحب نے کہا:

"تو بہتر یہی ہے کہ برات آنے سے پہلے اُسے روک دیا جائے۔ جگ ہنسائی ہوگی

اور حاصل کچھ نہ ہوگا۔"

وہ تو خیر گزری چند ملاقاتی آگئے اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔ دونوں ہی خاموش ہوگئے۔ جب مولانا صاحب جانے لگے تو مصافحہ کرتے ہوئے حاجی صاحب نے کہا:

"اس سلسلے میں جو بھی فیصلہ کردوں گا اس سے آپ ناراض نہ ہونا۔"

"آپ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔" مولانا صاحب نے جواب دیا۔
"آپ فیصلہ نہیں کریں گے تو ہم طے شدہ پروگرام کے مطابق برات لے کر آئیں گے آپ کو واپس کرنا ہوگا تو واپس کردینا۔"

اتنا کہہ کر مولانا صاحب گھر تو آگئے لیکن اس وقت سے ان پر گویا قیامت گزر رہی تھی۔ انہیں کبھی تو افسوس ہوتا کہ انہوں نے اپنے عزیز ترین دوست کو ایسا جواب کیوں دیا؟ اور کبھی یہ خیال ہوتا کہ چلو اچھا ہی ہوا قبل از وقت یہ باتیں ہوگئیں ـــ مگر جب ٹھنڈے دل سے اِن باتوں پر غور کرتے تو انہیں بہت ڈر لگتا کہ کل ـــ برات کے دِن خدا جانے کیا ہوگا؟

ـــ اور یہی بات انہیں پریشان کیے ہوئے تھی۔

مولانا صاحب حاجی صاحب کی ضدی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے ـــ وہ جانتے تھے کہ حاجی صاحب جب غصہ میں یا ضد میں ہوں تو انہیں سمجھانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ جب وہ دوسروں کے معاملہ میں اپنی بات منوا کر رہتے ہیں تو پھر یہ معاملہ تو ان کی بیٹی کا ہے اِس لیے مولانا صاحب زیادہ فکر مند تھے۔ اس لیے وہ بار بار اپنے پروردگار سے دُعا مانگ رہے تھے۔

"خدایا! کوئی ایسی بات نہ ہو جو دو خاندانوں کی تباہی کا باعث بن جائے۔"

اگلے دِن صبح ہی سے گھر میں برات کے سلسلے میں وہ چہل پہل، دوڑ دھوپ اور ہما ہمی ہوئی کہ مولانا صاحب اپنی فکر کو کچھ بھول سے گئے۔ مگر جب برات روانہ ہوئی، تو مولانا کا وہ خوف جو نہ جانے کہاں ندارد ہوگیا تھا، پھر ان پر حاوی ہوگیا ـــ خدا خدا کر کے

وہ مسجد آ گئی جہاں برات کو پہنچ کر ٹھہرنا تھا۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا مگر یہ حقیقت تھی مسجد کے دروازے پر استقبال کرنے والوں میں حاجی صاحب بھی تھے۔

برات مسجد میں بٹھادی گئی اور قاضی صاحب کے آتے آتے ایک مرتبہ پھر مولانا صاحب کو یہ سوال پریشان کرنے لگا۔ اب کیا ہوگا؟ کیا نکاح کی اجازت مل جائے گی؟ اگر نہیں ملی تو کیا برات واپس لوٹ جائے گی؟

مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ نکاح کی اجازت مل گئی اور نکاح بھی پڑھادیا گیا اور مولانا قریب قریب اس وقت اپنے ہوش وحواس میں آئے جب نکاح کے بعد لوگ انہیں مبارکباد دینے کے لیے آنے لگے۔ جب وہ ایک صاحب سے گلے مل کر پلٹے تو انہیں اپنے سامنے حاجی صاحب کھڑے نظر آئے جو اپنی باری آنے پر گلے ملنا چاہتے تھے۔

ان کو دیکھتے ہی مولانا صاحب بڑھ کر ان سے لپٹ گئے۔ انہیں خود پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا۔ آنسوؤں کی ایک جھڑی ان کی آنکھوں سے بہہ نکلی۔

یہی حالت حاجی صاحب کی تھی۔ وہ بھی مولانا صاحب کے کندھے پر سر رکھے آنسو بہا رہے تھے۔ یہ ایسا منظر تھا جو حاضرین نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سب ہی کے چہرے خوشی سے آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے۔

کھانے کے بعد جب وہ دونوں کمرے میں اکیلے ہوئے تو مولانا صاحب نے پہلی بات یہ کہی:

"مجھے تو ڈر لگ رہا تھا کہ آپ نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔"

"میں تو آج بھی اپنے فیصلے پر اٹل ہوں۔" حاجی صاحب نے جواب دیا۔

"جب میری بات آپ نے نہیں مانی تو میں نے کشور سے کہا: "تم اپنی مرضی کی مختار ہو۔ ہوسکتا ہے امین شادی کے بعد دوسرا نکاح کرلے۔ اگر تمہاری مرضی نہ ہو تو تم نکاح کی اجازت ہرگز نہ دینا۔ بھلے سے گھر آئی برات واپس لوٹ جائے۔"

"پھر....؟"

"پھر کیا...." اتنا کہتے ہوئے حاجی صاحب نے انہیں ایک رقعہ پڑھنے کو دیا جو حاجی صاحب کے نام لکھا گیا تھا۔ سلام کے بعد صرف اتنا لکھا تھا:

"میں انہی مولانا صاحب کا بیٹا ہوں جنہوں نے صرف میری ماں کے ساتھ اپنی زندگی گزار دی اور آج تک کسی دوسری عورت کا منہ نہیں دیکھا۔

نیاز مند — محمد امین"

●●

فیصلہ

قاضی محمد محسن کی بیگم اپنی بیٹی کے ساتھ دُھلے ہوئے کپڑوں کو تہہ تو کر رہی تھیں لیکن ان کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔

جیسے ہی قاضی صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے بے چینی کے ساتھ ان سے پوچھا:

"کون صاحب آئے تھے؟"

"کوئی نہیں۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے قاضی صاحب نے کہا۔

"لطیف سیٹھ کے ڈرائیور میاں عبدالجبار آئے تھے۔ یہ یاد دلانے کے لیے کہ شہر قاضی سے نکاح پڑھوانا ہے۔ کل صبح نو بجے لطیف سیٹھ کے ہاں سے بارات نکلے گی۔"

یہ سُن کر ان کی بیگم نے ان سے پوچھا:

"تو آپ کل سرور جہاں کا نکاح پڑھانے جائیں گے؟"

"کیوں! نہ جاؤں؟"

"ہاں! نہ جائیے۔" ان کی بیگم بولیں "جس کی شادی ہو اور وہی رضامند نہ ہو تو پھر یہ شادی کیسی ہوگی؟"

"کیا کہا؟" قاضی صاحب نے حیرت و استعجاب سے پوچھا "کیا سرور جہاں اس شادی کے لیے رضامند نہیں؟"

"میں نے تو یہی سُنا ہے۔" ان کی بیگم نے اثبات میں جواب دیا۔ "سرور تو اس شادی کے لیے کسی بھی قیمت پر تیار نہیں۔ اس لیے آپ نہ جائیں تو بہتر ہے۔ وہ اجازت

نہیں دے گی تو بارات واپس ہو گی اور بارات واپس ہو گی تو تکرار ضرور ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ نکاح کے وقت ہی کوئی جھنجھٹ ہو جائے، اس لیے میری بات مانیے اور نکاح پڑھانے کے لیے کسی اور کو بھیج دیجیے۔"

ایک ہی سانس میں انہوں نے اتنی ساری باتیں کہہ ڈالیں کہ قاضی صاحب حیرت سے ان کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ کچھ بولے نہیں۔ جب وہ خاموش ہوئیں تو انہوں نے پُر سکون لہجے میں دریافت کیا :

"تم سے یہ سب باتیں کس نے کہیں ؟"

"اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ مجھ سے یہ باتیں کس نے کہیں۔" ان کی بیگم صاحبہ نے کہا۔ "آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں اس کی منگنی میں گئی تھی۔ وہیں سے تو اس تنازعہ کی شروعات ہوئی۔"

"کچھ کہو تو سہی" قاضی صاحب نے بے چین ہوتے ہوئے کہا "کیسا تنازعہ ؟"

"یہی کہ شادی ـــ" ان کی بیگم صاحبہ رُکتے رُکتے بولیں "ہو گی بھی کہ نہیں۔ میں نے ایسا ہی سُنا ہے۔"

"کچھ کہو گی بھی کہ یہی رٹ لگائے رہو گی کہ شادی نہیں ہو گی۔" قاضی صاحب نے بیگم صاحبہ کی بات کاٹتے ہوئے جھنجھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"معلوم تو ہو کہ اتنی اچھی اور مثالی شادی کیوں نہیں ہو گی ؟ کتنی دھوم اور کتنا چرچا ہے اس شادی کا۔ شہر میں ہزاروں دعوت نامے تقسیم کیے جا چکے ہیں، اور ان گنت مہمان آ چکے ہیں دُور دُور سے۔ تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ شادی نہیں ہو گی۔ اگر یہ شادی نہیں ہوئی تو طوفان کھڑا ہو جائے گا تمہیں معلوم ہے۔"

قاضی صاحب کی آواز میں اتنی جھنجھلاہٹ اتنی کڑواہٹ تھی کہ ان کی بیگم اور ان کی لڑکی سہم گئیں۔

"یہ شادی شہر کے دو باعزت گھرانوں میں ہو رہی ہے۔"

انہیں اپنی جانب خاموش دیکھتے ہوئے قاضی صاحب نے دوبارہ کہنا شروع کیا:

"یہ شادی نہیں بلکہ شہر کی دو برادریوں کا ملاپ ہے۔ ایک نئی شروعات ہے دو طبقوں میں اچھے رشتے بڑھانے کی۔ ایک ذریعہ ہے ہم مسلمانوں کا ایک دوسرے سے اتحاد و اتفاق قائم کرنے کا۔ ایسی شادیاں تو روز ہونی چاہئیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" ان کی بیگم نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا "میں مانتی ہوں۔ لیکن جب کوئی نہیں چاہے تو کیا آپ اس کا نکاح پڑھا دیں گے؟ شادی میں کوئی الجھن کھڑی ہو جائے تو....؟"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں؟" قاضی صاحب نے بھی اتنی ہی آہستگی سے کہا جتنی آہستہ سے ان کی بیگم نے اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔

"اب یہ آپ کے — اور کسی کے بس — کی بات نہیں رہی۔" تہہ کیے ہوئے کپڑوں کو اٹھاتے ہوئے ان کی بیگم نے کہا "برقع جو بیچ میں آگیا ہے — وہ شادی نہیں ہونے دے گا — دیکھ لینا۔"

"برقع۔!" قاضی صاحب نے تعجب کے ساتھ کہا۔

"ہاں۔ برقع۔" ان کی بیگم بولیں "جہیز میں برقع دیا جائے یا نہیں دیا جائے اس سوال پر دونوں طرف کی عورتوں میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا ہے۔"

"برقع نہ دیں —" قاضی صاحب بول اٹھے۔ "لڑکی ڈاکٹر ہے۔ پھر اسے برقع کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر جہیز میں برقع دینا ضروری بھی تو نہیں۔ مگر یہ اتنی بڑی بات تو نہیں کہ شادی سے انکار کر دیا جائے۔"

"آپ بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟" ان کی بیگم صاحبہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ "سرور جہاں برقع نہیں پہنتی اس لیے وہ برقع دینا نہیں چاہتے — مگر

دولہا والی عورتیں برقع لینا چاہتی ہیں۔ مطلب یہ کہ ڈاکٹر صاحبہ اسپتال نہیں گھر سنبھالیں۔ نوکری چھوڑیں اور بچے پیدا کریں۔"

"اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر انہیں منگنی سے پہلے یہ باتیں طے کرنا چاہیے تھیں۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے؟ ایک ذرا سی بات سے اچھی بھلی شادی رُک جائے گی دونوں خاندانوں میں رنجش اور دشمنی پیدا ہو جائے گی سو الگ۔ جگ ہنسائی ہوگی اور کچھ نہ ہوگا۔"

"اسی لیے تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ نہ جائیں تو بہتر ہوگا۔ آپ پھر الجھن میں پڑ گئے تو ــــ"

"مجھے نکاح پڑھانے کے لیے بلایا ہے۔" قاضی صاحب نے کرسی سے اٹھتے اور پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا ــ "میں تو اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں تو جاؤں گا۔ چاہے پھر کچھ بھی ہو جائے۔ اب مجھے کچھ دیر آرام کرنے دو ــ آج تو میں بچوں کو سبق دیتے دیتے تھک گیا ہوں۔"

اتنا کہہ کر قاضی صاحب بستر پر لیٹ گئے اور ان کی بیگم اپنی لڑکی کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئیں۔

قاضی محمد محسن شہر کے قاضیوں میں سرِ فہرست شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ صرف نکاح ہی نہیں پڑھاتے بلکہ اپنے گھر میں ایک مدرسہ بھی چلاتے ہیں جس میں وہ بچوں کو عربی و فارسی کی تعلیم بھی دیا کرتے ہیں اور اپنی گزر بسر کے لیے گھر ہی میں ہاتھ کرگھے پر کپڑا بھی بنتے ہیں، جو ان کا آبائی پیشہ ہے۔

ان کے آبا و اجداد ۵۷ء کے غدر کے بعد شمالی ہندوستان کو خیرباد کہہ کر یہاں بس گئے تھے۔ انہوں نے اپنا آبائی پیشہ جاری رکھنے کے ساتھ اپنے علم و ادب کی تسکین کے لیے عربی و فارسی کی تعلیم دینے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔

قاضی صاحب کے والد مولوی محمد داؤد صاحب مرحوم عربی و فارسی کے جیّد عالم تھے، نہایت متقی و پرہیزگار، لوگ انہیں فرشتہ صفت انسان کہتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد قاضی صاحب نے ان کی جگہ سنبھالی اور ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور اپنا آبائی پیشہ بھی نہ چھوڑا۔

بعد میں انہوں نے اپنے کرم فرماؤں کے کہنے پر نکاح پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ جلد اس میں شہرت حاصل ہو گئی اور وہ ایک اچھے قاضی کی حیثیت سے دُور دُور مشہور ہو گئے۔

نکاح پڑھاتے وقت قاضی صاحب شریعت کی پابندی کو لازم قرار دیتے اور وہی نکاح پڑھایا کرتے جو شریعت کے مطابق ہوتے۔

وہ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں یا ان کی طبیعت ناساز ہی کیوں نہ ہو وہ کسی کے بُلانے پر نکاح پڑھانے چلے جایا کرتے۔ مگر جب بھی کسی کی طلاق کے وقت انہیں یاد کیا جاتا، تو وہ جانے سے انکار کر دیا کرتے، اور یہی کہتے کہ یہ میرا کام نہیں، تم کسی سوال نویس کے پاس جاؤ۔

کل صبح وہ جو نکاح پڑھانے والے ہیں وہ اسی شہر کے مشہور سیٹھ عبداللطیف کے چھوٹے صاحب زادے تنویر لطیف اور نامور زمین دار وصی الدین صاحب کی صاحب زادی سرورِ جہاں کے درمیان پڑھایا جانے والا ہے۔

لطیف سیٹھ اپنے نام کی طرح واقعی لطیف شخصیت و کردار کے مالک ہیں۔ ان کا اپنا پاورلوم کا کارخانہ بھی ہے اور چھوٹی سی سائزنگ بھی۔ وہ انصاری برادری سے ہیں اس لیے لطیف انصاری کہلاتے ہیں۔

وصی الدین صاحب پٹیل بھی اسی شہر کے مشہور رئیسوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایک قدیم خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے جیسا با اصول اور دبدبے والا انسان شہر میں ڈھونڈ نکالنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

جہاں ان کی ملنساری اور پُر خلوص محبت کا چرچا ہر طرف رہا ہے' وہیں لوگ ان کی غصیلی اور ضدی طبیعت سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ ایک مرتبہ کہنے کے بعد وہ اپنی بات سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ چاہے ان کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے۔

وہ زیادہ تعلیم یافتہ تو نہیں لیکن انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی سرور جہاں کو ڈاکٹر بنانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس دن انہوں نے دو رکعت شکرانے کی نماز ادا کی جس دن ان کی بیٹی سرور جہاں کا تقرر سرکاری اسپتال میں ہو گیا۔

قیصر لطیف اور سرور جہاں کا رشتہ طے ہونے پر سب خوش تھے مگر ابھی زیادہ دن نہیں بیتے تھے کہ دونوں طرف کی عورتوں میں کچھ باتوں پر اختلاف پیدا ہو گیا۔

دوپٹہ اُڑھانے کی رسم کے موقع پر جب کہ دونوں طرف کی عورتیں کافی تعداد میں موجود تھیں تو دولہا کی والدہ کی اس بات سے کہ ہم تو دلہن بٹیا سے نوکری نہیں کروائیں گے، خیال آرائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

یہ بات ایک بحث کا موضوع بن گئی کہ شادی کے بعد سرور جہاں کیا کرے گی؟ آیا وہ ڈاکٹری کرے گی یا گھر کی چار دیواری میں رہ کر گھر گرہستی سنبھالے گی؟

اسی سوال نے وصی الدین صاحب کے خاندان میں ایک کھلبلی مچا دی تھی اور ڈاکٹر سرور جہاں کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیا وہ ڈاکٹری چھوڑ دے گی؟ جسے اس نے اپنی زندگی کا بہترین مقصد مان کر اتنی محنت اور لگن سے پڑھی تھی۔

ڈاکٹری چھوڑ کر گھر کی چار دیواری میں قید ہو جانے کے خیال سے اس کو وحشت ہونے لگتی اور وہ کہہ بیٹھتی کہ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہو گا۔

اس کے برعکس دولہا کی والدہ اور دیگر رشتہ داروں کا کہنا تھا کہ گھر گرہستی ہی عورت کو زیب دیتی ہے۔ جب خاوند برسرِ روزگار ہو اور گھر میں خدا کا دیا ہُوا سب کچھ

موجود ہو تو پھر دلہن کیوں شہر شہر نوکری کرتی پھرے ؟

اس سے پہلے کہ یہ بات کسی نتیجہ پر پہنچتی، شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔

لطیف سیٹھ اور وصی الدین دونوں ہی اسلام کے ماننے والے اور سنّی مسلمان ہیں۔ مگر ہیں الگ الگ برادری کے۔ لطیف سیٹھ ہندوستانی یا انصاری برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور وصی الدین شہری برادری سے۔ ان دونوں برادریوں میں عام طور پر شادی بیاہ نہیں ہوتا۔ اس لیے جب یہ رشتہ طے ہوا تو سبھی کو بے حد خوشی ہوئی، لیکن کسی نے خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ایک معمولی سی بات بڑھ کر ایک جھگڑے کا روپ اختیار کر لے گی۔

اپنی بیگم سے قاضی صاحب کو جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ بھی زیادہ فکرمند ہوئے۔ اب وہ کیا کریں؟ نکاح پڑھانے جائیں یا نہ جائیں؟ کبھی تو انہیں خیال ہوتا کہ انہوں نے اپنے دونوں دوستوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہی نکاح پڑھائیں گے اس لیے انہیں نکاح پڑھانے ضرور جانا چاہیے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنا فیصلہ بدل دیتے۔ جب لڑکی ہی رضامند نہیں تو بلا وجہ الجھنوں میں پڑنے سے کیا فائدہ؟

اسی فکر میں وہ رات میں چین سے سو بھی نہ سکے۔ اگلے دن جب برات کا وقت قریب آ گیا تو وہ معمول کے مطابق تیار ہو کر گھر سے نکلے اور وصی الدین صاحب کے گھر پہنچ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد برات بڑی دھوم دھام کے ساتھ دلہن کے گھر تک آ گئی۔

براتیوں کو سجے سجائے پنڈال میں بٹھا دیا گیا۔ استقبال کرنے والوں نے قاضی صاحب کو لے جا کر دولہا کے بازو میں بٹھا دیا۔ اور نکاح کی تیاریاں ہونے لگیں۔

"کیا دلہن نکاح کی اجازت دے گی؟"

یہی سوال قاضی صاحب کے ذہن میں ایک ہلچل مچائے ہوئے تھا۔ اور رہ رہ کر انہیں اپنی ذمہ داری کا شدید احساس ہونے لگا۔ اگر کوئی غیر شرعی بات ہو گئی تو میں اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ انہوں نے سوچا کوئی روزِ محشر میرا دامن گیر ہو گا۔ یہ سب کچھ

جانتے ہوئے بھی میں نکاح پڑھاؤں گا تو مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہوگا۔ جس کو پروردگار کبھی معاف نہیں کرے گا۔

اس سے پہلے کہ قاضی صاحب کی ذہنی کیفیت کچھ اور ہوتی، گواہ اور وکیل آ کر ان کے پاس بیٹھ گئے۔ اپنے دلی احساسات پر قابو پاتے ہوئے قاضی صاحب نے شیروانی کی جیب سے قلم نکالا۔ اور نہایت شائستہ لہجے میں سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے دریافت کیا:

"کیا آپ کو وصی الدین صاحب نے اس شادی کے لیے وکیل مقرر کیا ہے؟"

"جی ہاں!" بیٹھے ہوئے شخص نے جواب دیا۔

"مگر میرا خیال ہے کہ آپ کی کوئی ضرورت نہیں۔" قاضی صاحب نے اسی لہجے میں کہا۔ "دلہن تعلیم یافتہ ہے — ڈاکٹر ہے۔ اسے یہاں لے آئیں۔ وہ یہاں آ کر اجازت دے گی تو نکاح پڑھایا جائے گا۔"

قاضی صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ پوری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص اپنی جگہ ششدر و حیران رہ گیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے قاضی صاحب؟" حاضرین کے دلی جذبات کی ترجمانی وکیل بن کر آئے ہوئے شخص نے کی "دلہن یہاں کیسے آسکتی ہے؟"

"دلہن یہاں نہیں آسکتی تو مجھے اس کے پاس لے چلیے۔" قاضی صاحب نے کہا "میں خود اس کی مرضی معلوم کروں گا، پھر نکاح پڑھاؤں گا۔ بہتر یہی ہوگا کہ اسے یہاں لے آئیں۔"

قاضی صاحب کے دوبارہ ایسا کہنے پر جہاں ایک طرف پوری محفل میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں وہیں کچھ لوگوں کے چہرے غصے سے سرخ ہو گئے۔ "مسلمانوں میں کیا دلہن سب کے سامنے آ کر اپنی رضامندی کا اظہار کرتی ہے؟"

مختلف آوازیں اٹھنے لگیں ۔ دولھا بھی خاموش نہ رہ سکا ۔ اس نے گردن جھکائے

آہستہ سے کہا :

" یہ بات ٹھیک نہیں ہوگی ۔ "

اس پر قاضی صاحب نے دولھے سے مخاطب ہو کر کہا :

" کیا بات ٹھیک ہوگی اور کیا بات ٹھیک نہ ہوگی اس کا فیصلہ پہلے ڈاکٹر سرور جہاں کو کرنے دو ، اس کے بعد تم فیصلہ کرنا ۔ سرور جہاں کو یہاں آنا چاہیے ۔ "

" مگر کیوں ؟ " دولہا کے خاموش رہنے پر کسی نے سوال کیا ۔

" اس لیے کہ آج اسے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنا ہے " قاضی صاحب نے جواب دیا ۔ " اور میں شریعت کے مطابق نکاح پڑھانے سے پہلے اس کی مرضی معلوم کرنا چاہتا ہوں ۔ "

" آپ اس کی مرضی وکیل صاحب کی معرفت معلوم کر سکتے ہیں " کسی صاحب نے کہا " مسلمانوں میں یہی دستور ہے ۔ "

قاضی صاحب بولے :

" مجھے معلوم ہے مسلمانوں میں کیا دستور ہے ۔ مگر یہ دستور اُن دلہنوں کے لیے ٹھیک ہے جو پردے میں رہتی ہیں لیکن جو پردے کی پابند نہیں ان کے لیے یہ دستور قطعی نامناسب ہے ۔ ہاں ! اگر سرور جہاں نکاح کے بعد پردے میں رہنا چاہتی ہے تو پھر بات دوسری ہے ۔ شادی کے بعد بھی اگر وہ پردے کی پابندی نہیں کرنا چاہتی تو پھر آج ہی پردے میں رہ کر اجازت دینا کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ "

اس پر کچھ لوگوں نے غصہ میں ایک ساتھ تیز آواز میں کہا :

" یہ ایک غیر شرعی بات ہوگی ۔ "

" کون کہتا ہے کہ یہ ایک غیر شرعی بات ہوگی ؟ " قاضی صاحب نے بھی تیز لہجے

میں پوچھا۔ "کیا شریعت یہ کہتی ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی رضامندی کا اظہار کیا جائے، اور عمر بھر اس کا پچھتاوا کیا جائے؟"

"پھر ایک ڈاکٹر دلہن کو اپنی مرضی کا فیصلہ کرنے دیجیے اور پرانے دستور کو بیچ میں نہ لائیے، ورنہ نکاح میں نہیں پڑھاؤں گا۔"

اتنا کہہ کر قاضی صاحب اپنی جگہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے:

"آپ کسی دوسرے قاضی کو بلوا لیجیے۔"

"ٹھہر جائیں قاضی صاحب!" وصی الدین صاحب نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا جو پاس ہی اپنے مہمانوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

"سرور جہاں یہاں آئے گی اور اگر اسے منظور ہوا تو یہ شادی ہوگی، ورنہ بارات واپس جائے گی۔"

اور پھر انہوں نے لطیف سیٹھ کو مخاطب ہو کر پوچھا جو اپنے غیر مسلم دوستوں اور بیوپاریوں میں گھِرے ہوئے نزدیک ہی بیٹھے تھے:

"کہیے لطیف سیٹھ — آپ کو یہ بات منظور ہے؟"

لطیف سیٹھ نے ایک نظر اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں پر ڈالی اور پھر وہ آہستہ سے اپنی جگہ کھڑے ہوتے اور کہا:

"مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔ آپ کہیں گے تو میں اپنے بیٹے کی بارات واپس لے جاؤں گا۔"

یہ سنتے ہی وصی الدین صاحب نے بڑی گرجدار آواز میں کسی کا نام لے کر پکارا، اور حاکمانہ انداز میں کہا:

"جاؤ سرور جہاں کو یہاں لے آؤ!"

جن صاحب کو حکم دیا تھا وہ مکان کے اندر چلے گئے۔ پنڈال میں چھائی ہوئی

خاموشی اور گہری ہو گئی۔ لطیف سیٹھ اور قاضی صاحب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور رونما ہونے والے واقعہ کا انتظار کرنے لگے۔

کیا سرور جہاں یہاں آئے گی ؟ اور اس نے شادی سے انکار کر دیا تو ــــ
تو کیا برات واپس جائے گی ؟

لمحہ لمحہ تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ لمحات اور گزرے تو سینوں میں دل دھڑکنا بند کر دیں گے

آخر خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وہ صاحب باہر آئے، جو دلہن کو لینے گئے تھے۔ سب ہی نے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا کہ ان صاحب کے پیچھے کچھ لڑکیاں دلہن کو لیے چلی آ رہی ہیں۔ لڑکیاں آ کر اس جگہ رک گئیں جہاں وصی الدین صاحب کھڑے تھے۔ سرور جہاں دلہن بنی ان کے سامنے کھڑی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا :

" جاؤ بیٹا ــــ اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرو۔ آج وہی ہو گا جو تم چاہو گی مجھے تمہاری خوشی منظور ہے۔"

سرور جہاں روتی ہوئی اپنے باپ سے لپٹ گئی ــ " ابو " اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

" ہمت سے کام لو بیٹا۔" وصی الدین صاحب نے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا پھر انہوں نے لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہا " اسے قاضی صاحب کے پاس لے جاؤ۔"

لڑکیوں نے دلہن کو لے جا کر قاضی صاحب کے سامنے بٹھا دیا۔

قاضی صاحب نے نکاح کے رجسٹر پر لکھی ہوئی تفصیل بتاتے ہوئے پوچھا :

" کیا تم اس نکاح کے لیے تیار ہو ؟ "

" نہیں ــ ! " دلہن کی آواز میں تیقن تھا " میں اس شادی کے لیے اس وقت

تک تیار نہیں ہوں جب تک یہ مجھے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میرے نظریات و خیالات کے ساتھ قبول نہیں کرتے۔"

"اس کی تم کچھ وضاحت کرو گی بیٹی"۔ قاضی صاحب نے کہا۔

"یہی کہ گھر کی چار دیواری میں میں قید ہونا نہیں چاہتی۔ میں وطن و قوم کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔"

"اور کچھ کہنا چاہتی ہو؟" قاضی صاحب نے پھر پوچھا۔

"جی نہیں۔"

دلہن کی کہی ہوئی باتوں کو دُہراتے ہوئے قاضی صاحب نے دولہا سے دریافت کیا۔

"کیا تمہیں یہ سب باتیں منظور و قبول ہیں؟"

دولہا کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اس نے آہستہ سے کہا:

"مجھے منظور اور قبول ہے۔"

دونوں طرف سے اقرار ہونے پر قاضی صاحب نے نکاح پڑھا دیا۔ نکاح کے بعد جب وہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے دُعا مانگ رہے تھے تو سبھی نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بند ہیں مگر ان میں سے آنسو بہے جا رہے ہیں۔

یہ منظر اتنا رقت انگیز تھا کہ شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کی آنکھوں سے آنسو نہ بہہ رہے ہوں۔ یا جس کا دل نہ بھر آیا ہو۔

جب دلہن کی رخصتی کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو ایک کمرے میں قاضی صاحب، لطیف سیٹھ اور وصی الدین صاحب باتوں میں مشغول تھے۔

"ہم تو سرور جہاں کو سمجھاتے سمجھاتے تھک کر نا اُمید ہو گئے تھے،" چائے پیتے ہوئے وصی الدین صاحب بولے "مگر آپ نے اسے سب کے سامنے بلا کر جو اس سے ہاں

کہلائی ہے وہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی ۔ آخر آپ کو یہ بات سوجھی کیسے ؟

" یہ بات مجھے کیوں سوجھی ؟ " اپنی جھکی ہوئی گردن اونچی کرتے ہوئے قاضی صاحب نے کہا " اِس لیے کہ آپ دونوں صاحبان نے جس جرأتِ رندانہ اور بے باکی کے ساتھ اپنے بچوں کو اس پاک رشتہ میں باندھنے کا ارادہ کیا تھا اس میں ان کی رضامندی اسی انداز سے ضروری تھی ، ورنہ اس ظالم دنیا میں بُرا چاہنے اور کسی کو خوش نہ دیکھ سکنے والوں کی کمی نہیں ۔ خدا اس رشتے کو نظرِ بد سے بچائے ۔ اچھا ـــــ اب مَیں چلوں ۔ آج مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ـــــ کسی کی طلاق کے وقت حاضر رہنا ہے ۔ یہ طلاق میری پوتی اور اس کے شوہر کے درمیان ہونے والا ہے ـــــ کاش ! اس کی شادی کے وقت ہم نے بھی ایسا ہی فیصلہ کیا ہوتا تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا ۔ "

●●

پہچان

"اے دو جہاں کے مالک! .... اے میرے مولا! .... میں نے آج تک کسی کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ اور نہ ہی کوئی ایسی بات کی جس سے کسی کی دل آزاری یا دل شکنی ہوئی ہو، پھر میرے معبود! میرے مشکل کشا! .... مجھ پر یہ مصیبت کیسی؟ کس گناہ کی پاداش میں مجھے یہ سزا دی جا رہی ہے؟ میرے پروردگار ...."

تلاوتِ قرآن کے بعد مولوی صاحب مصروفِ دعا تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ صبح کی نماز کے بعد ایک گھنٹہ تلاوتِ قرآن کیا کرتے تھے، پھر وہ مصروفِ دعا ہو جایا کرتے تھے، روزانہ دعا مانگتے وقت ان پر ایک عجیب سی رقت طاری ہو جایا کرتی تھی اور ان کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ ان کا پورا جسم لرزنے لگتا، گلا خشک ہو جاتا، آواز بھرا جاتی اور ان کی آنکھوں سے یوں آنسو بہنے لگتے جیسے جھڑی لگ گئی ہو۔

"یا الٰہی ....!"

ان کے منہ سے دعائیہ الفاظ بڑی مشکل سے نکل رہے تھے، ان کا جسم کانپنے لگا، دل سے اٹھنے والی ہوک نے انہیں اور زیادہ بے چین کر دیا۔ اپنی بے چینی دور کرنے کے لیے انہوں نے دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ جانماز پر رکھ دیے اور سجدے میں گر گئے۔

"اے میرے خدا .... اے میرے مشکل کشا! تیرا ہی سہارا ہے .... تو ہی ہماری مشکلیں دور کرنے والا ہے۔ ہم تجھ ہی سے دعا مانگتے ہیں۔"

ان کی لرزتی ہوئی آواز کمرے میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ چلئے کی ٹرے لاتے ہوئے ان کی بیٹی بلقیس دو مرتبہ واپس جا چکی تھی۔ تیسری مرتبہ جب وہ آئی تو مولوی صاحب

جانماز تہہ کر رہے تھے۔

"ابا! چائے پی لیجیے۔" بلقیس نے ٹرے میز پر رکھی۔ "ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"اچھا بیٹا!" مولوی صاحب نے جانماز ایک طرف رکھ دی۔ "تمہاری امّی کہاں ہیں؟"

"ابھی آتی ہیں۔" میز پر پھیلی ہوئی کتابیں جماتے ہوئے بلقیس نے جواب دیا۔

"وہی بڑی بی پھر آئی ہیں جو کل فتوے کے لیے آئی تھیں۔"

"اچھا۔" مولوی صاحب نے خالی پیالی میز پر رکھ دی۔ "پھر تم نے کیا سوچا بیٹا؟"

"میں کیا سوچوں ابا؟" بلقیس نے گردن جھکالی۔ "جب وہ ہی نہیں چاہتے تو پھر خود رہ کر جانے سے کیا فائدہ؟ ایک دن بھی تو وہ نہیں آئے۔"

ابھی وہ آگے کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ اس کی والدہ بڑی بی کے ساتھ کمرے میں آگئیں تو وہ خاموشی سے چائے کی ٹرے لے کر جانے لگی۔ مولوی صاحب نے ایک رجسٹر اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا:

"بیٹا۔ سیّد صاحب کو دے دینا اور کہنا کہ وہ پنچایت کی میٹنگ کی خبر سب کو دے دیں۔"

اور پھر انہوں نے ایک پرچہ بڑی بی کو دیتے ہوئے کہا:

"تمہارے سوال کا جواب لکھ دیا ہے۔"

جب بڑی بی سلام کر کے چلی گئیں تو مولوی صاحب پلنگ پر دراز ہو گئے۔ ان کی بیگم نے دری پر بیٹھتے ہوئے پاندان گھسیٹ کر اپنے سامنے رکھ لیا۔

"بتائیں تو سہی کہ آپ نے بڑی بی کو کیا جواب لکھا ہے؟"

"یہی کہ ـــ" مولوی صاحب پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "یہی کہ اس کی بیٹی

کا شوہر جب اپنی بیوی کو روٹی کپڑا نہیں دیتا، اور حقِ زوجیت ادا نہیں کرتا تو وہ اپنے داماد سے صاف صاف کہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس کے حقوق دے یا پھر اس کو طلاق دے دے۔"

"واہ مولوی صاحب!" ان کی بیگم صاحبہ پان بناتے بناتے رک گئیں۔ "آپ نے بڑی بی کو خوب صلاح دی۔ وہ بے چاری قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے اور آپ اس کی بیٹی کو اپنے شوہر سے طلاق لینے کے لیے کہہ رہے ہیں جو تین بچوں کی ماں ہے۔ بھلا اس عمر میں اس سے کون نکاح کرے گا؟"

"اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں"۔ مولوی صاحب نے ہاتھ بڑھا کر پان لیا۔ "گھٹ گھٹ کر مرنے سے اچھا ہے کہ صیاد سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ اللہ کو منظور ہوگا تو کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ اللہ کا بندہ کوئی ایسا مل جائے گا جو اس کے بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالے گا پوسے گا۔"

"آپ جتنے سیدھے سادے ہیں مولوی صاحب..." ان کی بیگم نے بات آگے بڑھائی "اتنا ہی سیدھا سادا سب کو سمجھتے ہیں۔ اس کا شوہر تو ایک نمبر کا چالاک ہے، وہ اتنی آسانی سے گائے سی بیوی کو نہیں چھوڑے گا جو دودھ بھی دیتی ہے اور مار بھی کھاتی ہے۔ بڑی بی سے بہت کچھ رکھوالے گا جب اس کا پیچھا چھوڑے گا۔"

"کچھ بھی ہو جائے" مولوی صاحب کو اپنی بیگم کی خوش دلی اچھی لگی۔ "بچی کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلانے کے لیے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

"آپ کے پاس اس کے لیے کوئی فتویٰ نہیں ہے۔" ان کی بیگم کی خوش دلی اپنی جگہ تھی۔ "ورنہ آپ بات بات پہ فتوے کی بات کرتے ہیں۔ اس بات کے لیے یہ فتویٰ ہے، اُس بات کے لیے وہ فتویٰ ہے۔"

"ہے فتویٰ۔" مولوی صاحب نے منبر پر سے تفسیر کی کتاب اٹھائی "مگر آج کل فتوؤں کو کون پوچھتا ہے؟ آج کل تو کورٹ کچہری کا زمانہ ہے۔"

"پھر آپ کیوں کہتے ہیں" ان کی بیگم نے پاندان بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ "ہمارا قانون سب سے اچھا ہے اس میں مداخلت مت کرو۔"

"وہ تو اصولوں کے لیے کہنا ہی پڑتا ہے" مولوی صاحب نے تفسیر کی کتاب کھولی، "ہمیں حکومت کی نیک نیتی پر بھروسہ نہیں ہے۔ ورنہ ہم بھی مانتے ہیں کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن کو نئے زمانے کے پیش نظر بدلنا چاہیے۔"

"وہ تو خیر چھوڑیے۔ نہ آپ بدلے ہیں نہ آپ کا زمانہ بدلے گا۔" ان کی بیگم مسکرائیں۔

"آپ نے بلقیس کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"میں اس کے بارے میں کیا سوچوں؟" مولوی صاحب نے کتاب بند کر دی" بلقیس خود سوچے اپنے بارے میں۔"

"آپ یونس میاں کو بُلا کر کیوں نہیں کہتے" ان کی بیگم نے سنجیدہ ہو کر سر پر دوپٹہ ٹھیک کیا" کہ وہ ایسی باتیں کہنا چھوڑ دے جس سے دلوں میں میل آتا ہو، ہماری بیٹی کو اٹھتے بیٹھتے طعنے تشنے دینا کچھ اچھی بات نہیں۔ بات بات پر یہ کہنا کہ تم شیعہ ہو، میں سُنی ہوں۔"

مولوی صاحب نے کہا:

"مجھے معلوم تھا کہ یہ بات ہوگی لیکن اس وقت تم نے میری بات نہیں مانی۔"

"مگر یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ شیعہ سنیوں کے جھگڑوں کو میاں بیوی کے درمیان لایا جائے۔ بیوی کو پہچان لینا چاہیے کہ وہ کیسی ہے؟ نہ یہ کہ ہمارا عقیدہ یہ' اور تمہارا عقیدہ وہ ہے۔۔۔"

"تم تو سنیوں کے دشمن ہو، تمہیں تو سنیوں کو ستانے میں ثواب ملتا ہے۔ تم ہمارے خلفاء کو بُرا بھلا کہتے ہو۔"

"اور کچھ" مولوی صاحب نے اظہارِ بے چینی کیا۔

"اب میں آپ سے کیا کہوں" ان کی بیگم نے عاجزی دکھائی۔
"وہ بلقیس سے کیسی کیسی باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارا نباہ مشکل ہے۔ مجھ سے طلاق لے لو۔"

"آخر وہ چاہتا کیا ہے؟" ہلکی سی جھنجھلاہٹ تھی مولوی صاحب کی آواز میں۔
"اور کیا چاہے گا وہ۔" ان کی بیگم بولیں "کہتا ہے بلقیس سنی ہو جائے تبھی نباہ ہوگا۔"

"لاحول ولا قوۃ" مولوی صاحب کی آواز میں جھنجھلاہٹ زیادہ تھی۔
"آپ سے میں سچ کہہ رہی ہوں۔" ان کی بیگم نے یقین دلایا "وہ یہی چاہتا ہے لیکن وہ اس کے لیے پنچایت کیوں کروا رہا ہے؟.... کیوں....؟ وہ پنچایت کروا کر ہمیں بدنام کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ایک تو ہماری بچی کو طلاق کی دھمکی دیتا ہے اور اس پر پنچایت کی بات کرتا ہے۔ بلقیس اب کسی بھی قیمت پر اس کے گھر نہیں جائے گی۔"

"اگر پنچایت کی گئی تو.... یا اگر پنچایت کہے گی تو...."
"تو....!" ان کی بیگم کی آواز میں غصہ کی جھلک تھی۔ "تو کیا.... پنچایت اپنے صدر کو بھی مجبور کرے گی کہ وہ اپنی بیٹی کو زبردستی اس کے گھر بھیج دے جو اس کا مذہب چھڑانا چاہتا ہے۔"

"پھر۔" مولوی صاحب نے ایک مرتبہ پھر کتاب سے نظریں اٹھائیں۔ "یہ پنچایت برادری کے سرداروں کی ہے۔ وہ جو بھی فیصلہ کریں گے ہمیں ہر حالت میں قبول کرنا ہوگا...."

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے مولوی صاحب۔" ان کی بیگم کی آواز میں بڑی لاچاری تھی۔ "اسے گھر سے اتنا ذلیل کر کے نکالا گیا اب وہ اس گھر میں کیسے جائے گی؟"
"لیکن" مولوی صاحب تفسیر کی کتاب میز پر رکھ کر پلنگ پر دراز ہو چکے تھے،

مجبوراً بیگم خاموش کمرے سے باہر چلی گئیں، کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ اب کچھ کہنا ہی بے کار ہے۔ اب مولوی صاحب کوئی بات کہنا سننا پسند نہیں کریں گے۔

مولوی منظور حسین ذکی ـــ شہر کی ان ہستیوں میں سرِ فہرست شمار کیے جاتے ہیں جن کو عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یوں تو وہ شیعہ ہیں لیکن اپنی علمیت اور قابلیت کی بنا پر کیا شیعہ اور کیا سُنی سبھی ان کا احترام یکساں طور پر کرتے ہیں۔ وہ ہیں بھی احترام کے قابل ـــ مذہبی اور دینی تعلیم سے آراستہ ـــ روزے نماز کے پابند ـــ متقی اور پرہیز گار ـــ بات کے دھنی اور مستقل مزاج ـــ حق بات کہنے اور ماننے والے ـــ کسی سے ڈرنے اور دبنے والے نہیں ـــ مذہبی احکامات کی سختی سے پابندی کرنے والے۔

ان کے والد بھی اپنے مذہب کے اتنے سچے اور پکے پیروکار تھے کہ کچھ مت پوچھیے۔ بڑے سے بڑا نقصان بھی وہ برداشت کر لیتے تھے لیکن مذہبی احکام سے پیچھے ہٹنا انہیں منظور نہیں تھا۔ قیامت کی گرمی میں بھی وہ پورے مہینے کے روزے رکھتے تھے۔

وہ مولوی گھرانے میں تو پیدا نہیں ہوئے تھے مگر ان کے والد نے انہیں ایک اچھا مولوی بنانے کا نہ صرف یہ کہ ایک خواب دیکھا تھا بلکہ ایک عہد بھی کیا تھا جو انہوں نے دن رات یا در لوم چلا کر بھی پورا کیا۔ اپنے وطنِ عزیز سے کوسوں دور رہ کر وہ اسی لگن میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک نہ ایک دن ان کی دلی تمنا بر آئے گی۔

ان کے والد اپنے مذہب کے اتنے سچے اور پکے ماننے والے تھے کہ لوگ ان کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ سخت گرمی میں وہ پورے مہینے کے روزے رکھ کر یا در لوم چلایا کرتے تھے۔ کتنی ہی تیز گرمی، سردی یا بارش ہو، انہیں ایک روزہ بھی چھوڑنا گوارا نہیں تھا۔ صبح کی نماز کہیں قضا نہ ہو جائے اس لیے رات میں ہی اپنے کپڑے دھو لیا کرتے تھے۔ جس کارخانے میں وہ لوم چلایا کرتے تھے اس کا مالک ان کی حد سے بڑھی ہوئی قدامت پسندی اور ان وضع قطع اور جنون کی حد تک روزہ نماز کی پابندی سے اکثر نالاں سا رہتا تھا۔ مگر انہوں نے اس کی

کبھی پرواہ نہیں کی۔ وہ کام پر سے الگ کر دیے جانے کی بات کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے ۔ اور جب کہ دوسرے مزدور پاور لوم چلایا کرتے وہ اپنے پاور لوم بند کر کے نماز پڑھنے چلے جایا کرتے تھے۔ وہ ایک اچھے اور محنتی کاریگر تھے اس لیے ان کے مالک نے بادلِ ناخواستہ نماز کے وقت پاور لوم بند کر دینے کی انہیں چھوٹ دے دی تھی۔

یہی سب باتیں، یہی سب عادتیں مولوی منظور حسین نے اپنے والد سے سیکھی تھیں، جن پہ انہیں بڑا ناز تھا کہ وہ اپنے والد بزرگوار کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہیں باتوں سے ویسے ہی پرہیزگاری اور تقویٰ کی وجہ سے وہ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

مولوی صاحب کے یہاں اولادیں تو چار ہوئیں لیکن بچی ایک ہی بچی، باقی تین اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اپنی بیٹی بلقیس کو انہوں نے زیادہ سے زیادہ مذہبی تعلیم سے آراستہ کیا اور اس پر جی جان سے عمل پیرا ہونے کی تلقین کی۔

بلقیس کی خوش قسمتی سے اس کی شادی بھی شہر کے ایک خوش حال گھرانے میں ہوئی۔ دن بڑے آرام سے گزر رہے تھے کہ بلقیس کے سسر کے انتقال کے بعد میاں بیوی میں ناچاقی دن بدن بڑھنے لگی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ چھ ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا وہ اپنے والد کے گھر پر ہی رہ رہی تھی۔

اس درمیان اس کا شوہر ایک مرتبہ بھی خیر خبر لینے کے لیے یا اسے اپنے گھر لے جانے کے لیے کبھی مولوی صاحب کے گھر نہیں آیا تھا، اور یہی بات ایک تنازعے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

اس تنازعے کے فیصلہ کے لیے وہ اب پنچایت کی میٹنگ کروانا چاہ رہا تھا۔ مجبور ہو کر مولوی صاحب کو پنچایت کی میٹنگ کرنا پڑی۔

محلہ میں ایک پرانی درس گاہ ہے جو خانقاہ کے نام سے مشہور ہے اسی درس گاہ

کے وسیع ہال میں پنچایت کی میٹنگیں ہوا کرتی ہیں۔ اس رات بھی بعد نمازِ عشاء پنچایت کی میٹنگ اسی ہال میں رکھی گئی تھی۔ اپنی بیگم کی ناراضگی کے باوجود مولوی صاحب تیار ہو کر میٹنگ ہال پہنچ گئے۔

جب انہوں نے درس گاہ کے بڑے ہال میں قدم رکھا تو انہوں نے کثیر تعداد میں لوگوں کو اپنا منتظر پایا۔ کچھ دیر یونہی گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ پھر پنچایت کی میٹنگ کی کارروائی شروع ہوئی۔

جیسے ہی پنچایت کے صدر ہونے کی وجہ سے مولوی صاحب کا نام صدارت کے لیے پیش ہوا تو مولوی صاحب نے اُٹھ کر حاضرین سے گزارش کی کہ:

"آج کی میٹنگ کی صدارت کے لیے مجھے معاف فرمائیں کیوں کہ آج کی میٹنگ میں میری بیٹی کے معاملے پر غور و خوض کیا جانا ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ میرے بجائے کسی اور کو صدر چن لیا جائے۔"

ان کی اس تجویز پر برادری کی ایک دوسری بزرگ ہستی عبدالحمید صاحب کو اتفاقِ رائے کے ساتھ صدر بنا لیا گیا۔

محمد یونس نے حاضرین کو بتایا کہ:

"میں اپنی بیوی جو مولوی صاحب کی صاحب زادی ہے اس سے علاحدگی اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ ہم نے یہ شادی باہمی رضامندی سے کی تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ اس وقت مولوی صاحب اس شادی سے خوش نہیں تھے کہ ہم الگ الگ فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ہماری خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہ بعد میں وہ ہماری خوشی کی خاطر اس شادی پر رضامند ہو گئے۔

شادی کے بعد کچھ دن تو ہنسی خوشی گزرے مگر ہمیں جلد ہی اس تلخ حقیقت کا احساس ہو گیا کہ میری بیوی ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئی ایک شیعہ ہے اور میں ایک

سُنّی گھرانے میں پیدا ہُوا ایک سُنّی مسلمان ہوں۔ ہمارے عقائد میں زمین آسمان کا فرق ہے یہ بات ہم پہلے نہیں جانتے تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ہم میں ناچاقی دن بدن بڑھنے لگی اور نوبت تو تو میں میں سے بڑھ کر روز روز کے جھگڑوں تک پہنچ گئی۔

اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ ایک دوسرے کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں ہے۔ میری بیوی کئی ماہ سے اپنے ماں باپ کے گھر رہ رہی ہے، اور میں جیسے تیسے اپنی زندگی بسر کر رہا ہوں، اس لیے میں ہماری بہتری اسی میں خیال کرتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں، جس کی صورت طلاق کے سوا اور کچھ نہیں۔"

یہ سب باتیں حاضرین حیرت و استعجاب سے سنتے رہے۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔

جب یونس میاں اپنی بات ختم کر کے بیٹھ گئے تو ایک صاحب نے جاننا چاہا کہ طلاق کے علاوہ مفاہمت کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

اس پر یونس میاں کی جانب سے کہا گیا کہ بلقیس جہاں کو جس کے ساتھ نباہ کرنا ہے اس کا عقیدہ ماننا ہوگا۔ اسے شیعہ عقائد چھوڑ کر سنّی عقائد ماننے ہوں گے۔

یہ بات کچھ لوگوں کو ناگوار گزری۔ کئی لوگوں نے سخت اعتراض کرتے ہوئے اپنے غم و غصّہ کا اظہار کیا اور اپنی ناپسندیدگی بھی ظاہر کی۔

بنجایت پر سنجیدگی طاری تھی مگر یہ سنجیدگی جتنی بظاہر نظر آرہی تھی اتنی دلوں کے اندر سنجیدگی نہیں تھی، کیوں کہ معاملے کی نوعیت نے ہر شخص کو کسی نہ کسی طرح سے متاثر ضرور کیا تھا۔ ہمدردیاں اور خیالات بٹ چکے تھے۔ حمایت اور مخالفت میں لوگ دبی زبان سے اور کھل کر اظہارِ خیال کرنے لگے۔ اختلافِ رائے نے میٹنگ میں گرما گرمی پیدا کر دی۔

سنجیدہ مزاج اور صلح پسند انسانوں نے جوں جوں شعوری کوشش کی کہ معاملہ سلجھ جائے۔ مگر معاملہ رفتہ رفتہ اور زیادہ الجھتا چلا گیا۔ غیر ضروری بحث و مباحثے نے معاملے کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔

سمجھدار لوگوں کی کوشش سے بات بالآخر اس سوال پر آ کر ٹھہر گئی کہ مفاہمت کی آخر کیا صورت ہو سکتی ہے؟

کسی نے کہا:

"مفاہمت کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے۔ بلقیس کو حسن کے ساتھ نباہ کرنا ہے اس کا عقیدہ ماننا ہوگا، یعنی اسے سنّی مسلمان کے طور طریقوں کو اپنانا ہوگا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" شیعہ مذہب کے ایک حامی نے جھنجھلا کر سوال کیا۔ "بلقیس شیعہ ہے اور شیعہ ہی رہے گی۔ چاہے تم اسے طلاق ہی کیوں نہ دے دو۔ وہ طلاق لینا منظور کرے گی لیکن شیعہ عقائد چھوڑ کر سنّی عقائد ماننے پر کبھی رضامند نہیں ہوگی۔"

اور اس سے پہلے کہ یہ سوال کوئی ایسی صورت اختیار کر لیتا جو سبھی کے لیے پریشانی کا باعث ہوتی، مولوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے کھڑے ہوتے ہی خاموشی چھا گئی۔

"ٹھیک ہے۔" مولوی صاحب نے کہا "اگر یونس میاں چاہتے ہیں کہ بلقیس شیعہ مذہب کو چھوڑ سنّی مذہب اختیار کرے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

ابھی مولوی صاحب یہاں تک ہی کہنے پائے تھے کہ کسی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا:

"ایسا ہی تھا تو یونس میاں کو پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا..... وہ خود کیوں نہیں شیعہ ہو جاتے۔"

اس پر ناگواری اس قدر بڑھی کہ بیچ بچاؤ کرنا مشکل ہو گیا۔ شیعہ سنّی عقائد زیر بحث آنے لگے۔ ہر ایک کی ضد تھی کہ وہ اپنا عقیدہ کیوں چھوڑے؟ ہر شخص چاہتا تھا کہ اس کے عقیدے کی پہچان باقی رہے۔

مولوی صاحب کافی دیر سے یہ سب باتیں بڑے صبر و تحمل کے ساتھ سن رہے تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ صبر کے گھونٹ پی رہے تھے۔ ایک تو معاملہ ان کی بیٹی کا اور دوسرے ان کے عقائد زیر بحث لائے جا رہے تھے، یہ بات اس لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ شرمندگی کے شدید احساس

احساس سے وہ زمین میں گڑے جارہے تھے اور مارے غصّہ کے ان کے تن بدن میں آگ سی لگی ہوئی تھی، مگر اپنی طبیعت اور عادت کے مطابق وہ صبر و سکون کے ساتھ یہ سب باتیں سہہ رہے ہیں۔ یہ باتیں ان کے کانوں پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہی تھیں۔ ان کے سینے میں جوالا مکھی دہکنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹی کا ہی نہیں اپنے پورے خاندان کا مستقبل تاریک ہوتا نظر آنے لگا۔

انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ یونس میاں ہیں جو ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ آج اپنے اصل روپ میں آگئے ہیں، اور وہ روپ ہے ایک سنّی مسلمان کا۔ کیا سنّی مسلمان شیعہ عقائد کے اتنے ہی مخالف ہیں جتنی مخالفت وہ ظاہر کر رہے ہیں؟

کیا سچ مچ شیعہ مذہب اتنا ہی بُرا ہے کہ ایک خاوند کسی بھی قیمت پر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی شیعہ ہو؟ کیا بیوی کا شیعہ ہونا کوئی گناہ ہے؟ بیوی کی تمام خوبیاں کیا اس بات کے لیے نظر انداز کی جا سکتی ہیں؟ نہیں تو پھر یہ جھگڑا کس بات کا؟ کیوں یونس انہیں تباہ و برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہیں ـــ؟ یہ اور اس طرح کے بہت سے خیالات ان کے دل و دماغ میں ایک ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ خاموش رہنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔

جب گفت و شنید میں تیزی بڑھ گئی اور بات تکرار تک پہنچ گئی تو مولوی صاحب ایک مرتبہ پھر کچھ کہنے کے لیے اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ یہ دیکھ کر سبھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

مولوی صاحب کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر انہوں نے آہستہ سے اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھائی اور کہا:

"ٹھیک ہے اب کچھ کہنا بے کار ہے۔ جیسی یونس میاں کی مرضی۔ وہ اپنی بات پر بضد ہیں تو پھر وہ بلقیس کو طلاق دے دیں۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے قریب ہی بیٹھے ہوئے اپنے ایک عزیز سے کہا:

"آپ جائیے ـــ اور بلقیس کو یہاں لے آئیے ـــ تاکہ اس کے سامنے یونس میاں طلاق دے سکیں۔"

"بلقیس یہاں کیسے آ سکتی ہے؟" کسی صاحب نے اعتراض کیا۔ "طلاق اس کی غیر موجودگی میں بھی دی جا سکتی ہے۔"

"بلقیس کی موجودگی ضروری ہے۔" اپنی بات پر مولوی صاحب نے زور دیا۔

"بلقیس شیعہ ہے اور شیعہ قانون کے مطابق ہی اس کے سامنے طلاق دیا جانا چاہیے۔"

"مگر..." کسی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "یونس میاں تو سنّی ہیں اور سنّی قانون کے مطابق شوہر اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں بھی طلاق دے سکتا ہے اور چاہے تو لکھ کر بھی طلاق بھیج سکتا ہے۔"

اس پر مولوی صاحب نے پُر سکون لہجے میں جواب دیا:

"سنّی عقیدے کے مطابق ایسا کیا جا سکتا ہے لیکن شیعہ قانون کے مطابق ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ بیوی شیعہ ہے تو شیعہ قانون ہی لاگو ہوگا۔"

اتنا کہہ کر انھوں نے اپنے اسی عزیز سے پھر کہا:

"جائیے! بلقیس کو یہاں لے آئیے۔ اور اس سے کہنا کہ وہ بغیر برقع کے یہاں آ جائے۔"

یہ سنتے ہی حاضرین کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ حیرت و استعجاب کے مارے لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے یہ مولوی صاحب کو کیا ہو گیا ہے؟ بھری پنچایت میں وہ اپنی بیٹی کو بغیر برقع کے لانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مولوی صاحب!" ایک بزرگ سے آخر نہیں رہا گیا۔ "آپ اپنی صاحب زادی کو بے پردہ سب کے سامنے بلائیں گے؟"

"ہاں! اس میں ہرج ہی کیا ہے؟" مولوی صاحب کی سنجیدگی اپنی جگہ تھی۔ کم از کم یونس میاں تو اسے پہچان جائیں گے۔ پھر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہے گی، کہ

انہوں نے کس کو طلاق دیا؟ اس لیے بلقیس کو یہاں بغیر برقع کے آنا چاہیے۔"

"ایسا نہ کیجیے مولوی صاحب ــ" کسی نے التجا کی۔

"ایسا ہی کیا جانا بہتر ہے۔" مولوی صاحب اپنی بات پر اٹل رہے۔

"ایسا جیسا کہ یونس میاں چاہتے ہیں کیے جانے پر بلقیس کو بھی اپنے طور پر زندگی بسر کرنے کا حق ہے۔ اگر وہ بھی ان پابندیوں سے آزاد ہونا چاہتی ہے تو پھر اسے اس کی اجازت ہونا چاہیے۔"

مولوی صاحب ایک لمحے کے لیے رُکے اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا انہوں نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ پُر اثر انداز میں دوبارہ کہنا شروع کیا:

"آخر میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ یونس میاں کو اتنے دنوں میں اس ذات کی پہچان نہیں ہوئی جس کا نام عورت ہے۔ عورت کی پہچان اس کے مذہب و عقیدے سے نہیں ہوتی، نہ ہی اس کے رنگ روپ سے ہوتی ہے اور نہ ہی اس کی حیثیت و قیمت سے ہوتی ہے۔ عورت کی پہچان اس کی ذات میں مضمر ہوتی ہے۔ عورت کی پہچان اس کی وفاداری میں ہے ــ یہ پہچان اس کے عقیدے سے کی جا سکتی ہے جس عقیدے کے تحت وہ اپنے شوہر کو اپنا سرتاج اور مجازی خدا سمجھتی ہے۔"

اس کے آگے مولوی صاحب کچھ نہ کہہ سکے، کیوں کہ ان کا دل بھر آیا تھا اور آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ انہوں نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا:

"انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی تھی جو اس وقت میں اپنی پہچان بھول گیا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے۔ دیکھنے والوں کو اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ ان کا چہرہ اب بھی بول رہا ہے اس زبان میں جو صرف دل والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس وقت ان کے دل و دماغ کی حالت کیا ہے؟ یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ لوگوں کی نظریں کبھی تو مولوی صاحب کا

جائزہ لینے لگتیں اور کبھی یونس میاں کی طرف اٹھ جاتیں۔

لوگ چپ سادھے سانس روکے ہوئے بیٹھے تھے کہ اب کیا ہوتا ہے؟ کیا بلقیس کو یونس میاں طلاق دے دیتے ہیں یا پھر وہ اپنے اس فیصلہ کا اعادہ کریں گے کہ بلقیس کو اپنا عقیدہ بدلنا ہوگا۔

گردن جھکائے یونس میاں گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر وہ اپنی جگہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حاضرین یہ سمجھے کہ اب وہ اپنے فیصلے سے انہیں آگاہ کر دیں گے۔ فیصلہ کا وقت نزدیک آگیا ہے۔

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، وہ اپنی جگہ سے چل کر وہاں تک گئے جہاں مولوی صاحب گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے جا کر وہ دو زانو بیٹھ گئے۔

"میری اس گستاخی کو معاف کر دیجیے۔" وہ روندھے ہوئے گلے سے کہہ رہے تھے۔ آواز بری طرح تھرائی ہوئی تھی "آپ نہیں..... میں اپنی پہچان بھول گیا تھا" اور وہ بری طرح رو پڑے۔

اب مولوی صاحب کے لیے اور زیادہ اپنے آپ پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ یونس میاں کے آنسوؤں نے جیسے انہیں پگھلا دیا۔ اب ان کا دل پسیج گیا۔

ایک مرتبہ انہوں نے یونس میاں کو دیکھا اور پھر انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور یونس میاں کے سر پر رکھ دیا۔ پھر تو جیسے رکے ہوئے دریا کا بند ٹوٹ گیا۔ ان کی خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کا کلیجہ بادلوں کی طرح کیوں پھٹا جا رہا ہے، اور کیوں ان کی آنکھوں سے آنسو آبشار کی طرح بہے جا رہے ہیں۔

یونس میاں ایک دم جھکے اور انہوں نے مولوی صاحب کے پاؤں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ بس محفل تو جیسے پھوٹ پڑی۔ ہر کسی کی آنکھوں سے آنسو یوں بہہ رہے تھے جیسے جھڑی سی لگ گئی ہو۔

"بٹیا..." آخر مولوی صاحب نے سکوت توڑا۔ "ہم اس لیے شیعہ ہیں کہ یہ ہمارے بزرگوں کا عقیدہ ہے اور تم بھی اس لیے سنّی ہو کہ یہ تمہارے آبار و اجداد کا عقیدہ ہے۔ نہ ہم اس لیے شیعہ بنے ہیں کہ دوسروں کا دل دکھائیں اور نہ ہی تم اس لیے سنّی بنے ہو کہ تم اپنا عقیدہ کسی سے زبردستی منواؤ۔ پہچان کا کیا ہے؟ انسان جب تک زندہ ہے کوئی نہ کوئی پہچان اس سے وابستہ رہے گی۔ مرنے کے بعد بھی اس کی پہچان زندہ رہے گی۔ عقیدے تو دل سے مانے جاتے ہیں، مانو تو عقیدہ ہے نہ مانو تو کچھ بھی نہیں۔" اتنا کہہ کر انہوں نے رومال سے اپنا منہ صاف کیا اور پھر انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ اور دل کش اور دل میں اتر جانے والی ان کی قرأت درس گاہ کے وسیع ہال میں گونج رہی تھی۔

"یا اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین!"

●●

کوئی اور نہیں

نواب مختارالدین بے چینی کے ساتھ اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں؟ گولی کھائے ہوئے شیر کی مانند وہ بپھرے ہوئے تھے۔

نواب صاحب اس رات ہی سے جس رات کی یہ بات ہے دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ انہیں اپنے ملازم پر جتنا غصہ تھا اس سے زیادہ اپنے آپ پر تھا۔

سچ پوچھو تو انہیں اس بات کا پچھتاوا تھا کہ انہوں نے ایسی بات جاننا ہی کیوں چاہی، جس کے جاننے کے بعد ان کا آرام و سکون چھن گیا۔ اپنی زندگی میں وہ کبھی اتنے بے چین نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی ان پر اتنی بے کسی کا دور کبھی گزرا تھا۔

اس سے پہلے تو جب بھی ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہوتی تھی تو وہ قیامت مچا دیتے تھے۔ ان کے دل و دماغ کی عجب حالت ہو گئی تھی۔ کبھی تو غصہ میں ان کا خون کھولنے لگتا۔ کبھی تو انہیں اپنے ملازم کی وفاداری اور خدمت پر پیار آنے لگتا، پھر تھوڑی دیر ہی بعد ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس کو گولی مار دیں۔

ایک بڑی ہی خوش گوار رات کا واقعہ ہے جب نواب صاحب بہت زیادہ موڈ میں تھے اور موسم بھی پینے پلانے کا تھا۔ ابھی انہوں نے تین چار پیگ ہی پیے تھے کہ ان پر سرور چڑھنا شروع ہوا۔ اور انہوں نے رومانٹک انداز سے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے تاجو سے پوچھا:

"تم نے کبھی محبت کی ہے؟"

اب بھلا تاجو، جو ان کا ملازم تھا اپنے مالک کو کیا جواب دیتا؟ بے چارا صرف مسکرا کر رہ گیا۔ شراب کے نشے میں نواب صاحب پر تاجو کی محبت جاننے کی دھن سوار ہو گئی اور انہوں

نے پھر اپنا سوال دُہرایا:

"بتاؤ تاجو — تم نے محبّت کی ہے؟"

"محبت — ! میں کیا بتاؤں نواب صاحب —" تاجو نے رُکتے رُکتے جواب دیا "محبت کیا ہوتی ہے؟"

"بتلاؤ — اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟ محبت ہر شخص کرتا ہے کسی نہ کسی سے"۔

"لیکن حضور — ہم غریب لوگ کیا کھا کر محبت کریں گے؟"

پھر بھی نواب صاحب نے گردن سے اشارہ کیا:

"ہاں ہاں بتاؤ! تم نے کبھی محبّت کی ہے؟"

تاج محمد جو اپنے مالک کے پھیلے پاؤں داب رہا تھا، اس اصرار پر بھی خاموش رہا۔ نواب صاحب کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنی اُجاڑ زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈال رہا ہو۔ کیا اس کی روکھی پھیکی زندگی میں بھی کوئی رومان ہے؟ کیا اس نے بھی کسی کو چاہا ہے؟

نواب صاحب نے اس کے جھکے ہوئے چہرے سے کچھ اندازہ لگانا چاہا لیکن تاج محمد کا چہرہ کچھ اس قسم کا تھا جس سے اس کے دل کا حال جاننا مشکل تھا۔

"ہاں تبلاؤ" نواب صاحب نے پھر پوچھا۔

تاج محمد نے جھکی ہوئی گردن اٹھائی۔ نواب صاحب کی نظروں سے نظریں چار ہوئیں، پھر جھک گئیں۔

"حضور مجبور نہ کیجیے"! تاج محمد نے عاجزی کے ساتھ کہا "مجھے کام دھندے سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے کہ محبّت وحبّت کر سکوں۔ اب میں آپ کو کیا تبلاؤں کہ کس سے محبّت کی .....؟"

جیسے جیسے تاج محمد انکار کر رہا تھا، نواب صاحب کو یقین آ چلا تھا کہ اس نے ضرور کسی سے محبّت کی ہے اس لیے وہ اپنا ہی سوال دُہراتے رہے:

"ہم کہتے ہیں کہ تم نے ضرور کسی سے محبت کی ہے۔ بتاؤ تمہیں کس سے پیار ہے؟"

"پیار۔" تاج محمد نے تعجب کے ساتھ لفظ پیار کو دہرایا۔

"ہاں۔ پیار۔"

تاج محمد بولا:

"پیار تو بڑے لوگوں کو ہوتا ہے سرکار!"

"بڑے لوگوں کو ہوتا ہے" نواب صاحب نے کہا "یہ ہم جانتے ہیں، خود ہم نے بے شمار پیار کیے ہیں۔ لیکن ہم تمہارا پیار جاننا چاہتے ہیں۔ اب وقت ضائع نہ کرو۔ جلدی سے ہمیں اپنی پیار بھری داستان سنا دو، آج ہم تم سے پوچھ کر ہی دم لیں گے۔"

"آپ کہتے ہیں تو میں نے پیار کیا ہے۔"

تاج محمد نے رکتے رکتے اقرار کیا۔ کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نواب صاحب جتنے نازک مزاج ہیں اتنے ہی تنک مزاج بھی ہیں۔ مسلسل انکار ان کا موڈ خراب نہ کر دے۔ اس اندیشہ نے اس کو اقرار پر مجبور کر دیا۔

"دیکھو اب آئے نا سیدھے راستہ پر۔" نواب صاحب نے آرام کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے دونوں ہاتھ سر پر باندھ لیے، ساتھ ہی پیر بھی پھیلا دیے۔ سرور کی ایک لہر اُن کو کچھ دیر کے لیے کسی دوسری دنیا میں لے گئی۔

تاج محمد کسی گہری سوچ میں ڈوبا پاؤں داب رہا تھا۔ غیر شعوری طور پر اس کے ہاتھ نواب صاحب کے پیروں کو داب رہے تھے۔

پوری کوٹھی پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چودھویں کا چاند چاندنی بکھیر رہا تھا۔ نواب صاحب کی بیگم صاحبہ اپنے بچّوں کو سُلانے اپنی خواب گاہ جا چکی تھیں۔ تاج محمد کے جانے کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ وہ کب کا چلا بھی گیا ہوتا اگر نواب صاحب پیر دبواتے وقت پیار و محبت کی باتیں نہ چھیڑ دیتے۔

نواب مختارالدین شہر کے پرانے جاگیردار تھے۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں ان کے آباء و اجداد یہاں کے صوبیدار تھے۔ جب مغلوں کی حکومت ختم ہوئی اور انگریزوں کا راج شروع ہوا، تو ان کے دادا انگریزوں کے وفادار ہو گئے۔

ان کے والد افتخارالدین نے بھی مرتے دم تک انگریزوں سے وفاداری نبھائی جس کی بدولت ان کی بچی کھچی جاگیر باقی رہی اور وہ نواب کہلائے، پھر ان کا پورا خاندان نواب خاندان کہلایا جو دُور دُور تک اپنی شان و شوکت کا جواب نہیں رکھتا تھا۔

لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے نوابی شان پھیکی پڑتی گئی۔ نواب مختارالدین جیسے تیسے اپنے نواب ہونے کی شان برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں بڑے نواب صاحب کی چھوڑی ہوئی جائیداد کام آ رہی تھی۔ نقد روپیہ اور زیورات تو کب کے ختم ہو چکے تھے۔

نواب صاحب کو اپنی جائیداد کے چھن جانے کا شدید غم تھا۔ آمدنی کے ذرائع محدود ہو گئے تھے۔ کفایت شعاری میں "نوابی" ہاتھ سے جاتی تھی۔ اس لیے نواب صاحب اکثر غم غلط کرنے کو دخترِ رز سے دل بہلایا کرتے تھے۔

آج شام بڑی سہانی اور خوشگوار تھی اس لیے انہوں نے شروع شام ہی سے پینا شروع کر دیا تھا۔ پہلا جام چڑھاتے ہوئے نہ جانے ان کو اپنی پہلی محبت کیسے یاد آ گئی جو انہیں اپنی ملازمہ کی شادی شدہ خوب صورت بیٹی سے ہو گئی تھی۔

پہلی محبت کے بعد محبت ان کے لیے ایک کھیل ہو کر رہ گئی۔ کسی سے انہوں نے محبت نہیں کی اور کسی پر انہوں نے جان نہ چھڑکی۔ عورت کا جوان ہونا شرط تھا۔ جوان عورت کو دیکھ کر تو ان کے دل میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ آئے دن کسی نہ کسی سے ان کی محبت کا سلسلہ چلتا رہتا۔ آج اس سے عشق لڑایا جا رہا ہے، تو کل اس سے محبت کی جا رہی ہے، اور پھر کسی اور کے لیے آہیں بھری جا رہی ہیں۔

ایک عشق میں تو ان کی جان پر بن آئی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ نواب صاحب کو ایک

جوان بیوہ سے محبت ہوگئی تھی جوان کے محلے میں کہیں سے آکر آباد ہوگئی تھی۔ بقول نواب صاحب اگر کسی پر جوانی آئی تھی تو وہ صرف رشیدہ پر آئی تھی۔

کچھ دنوں کے ہیر پھیروں کے بعد ان کے درمیان سلام و پیام کا سلسلہ شروع ہوگیا اور پھر چوری چوری ملاقاتیں ہونے لگیں اور آخر میں بات یہاں تک پہنچی کہ رشیدہ سب کی نظریں بچاکر نواب صاحب کی خواب گاہ میں راتیں گزارنے لگی۔

ایک رات جب کہ رشیدہ نواب صاحب کی خواب گاہ میں تھی تو اچانک اس کا بھائی آن پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ ایک ہی وار میں رشیدہ چیخ مار کر زمین پر ڈھیر ہوگئی، دوسرا وار اس نے نواب صاحب پر کرنا چاہا لیکن وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور جب وہ اپنے نوکروں کے ساتھ خواب گاہ میں واپس پہنچے تو حملہ آور خودکشی کر چکا تھا، اور رشیدہ بھی دم توڑ چکی تھی۔

یہ واقعہ تب کا ہے جب بڑے نواب صاحب بقید حیات تھے اس لیے اس کی گونج کہیں بھی سنائی نہ دی۔ اس قسم کے کئی چھوٹے موٹے واقعات ہوئے لیکن نواب صاحب نے ان کو کبھی خاطر میں نہ لایا۔ اب بھی جب کہ ان کی عمر چالیس سال کی حد پار کر چکی تھی اور ان کا کسرتی بدن گوشت کی موٹی موٹی تہوں میں چھپ چکا تھا، ان کو اپنی محبتیں بہت یاد آتی تھیں اور وہ خود کو جوان محسوس کرنے لگتے۔

جب سے رقیہ بیگم ان کی زندگی میں آئی تھیں، وہ کچھ راہ پر آگئے تھے۔ پھر بھی جب کبھی ان کا عشق جوش مارتا، تو وہ خوب صورت چہروں اور جسموں کو تلاش کرنا شروع کر دیتے۔

تاج محمد — جو کہ ان کا بہت پرانا خادم تھا ان کے تمام معاشقوں میں پیش پیش رہتا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ نواب صاحب کے کئی معاشقے صرف تاج محمد کی کوششوں سے اپنی انتہا کو پہنچے۔ کئی مرتبہ وہ نواب صاحب کے آڑے وقت میں کام آیا۔ نواب صاحب کو آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب اس تاج محمد نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس

بات کا اقرار بڑے نواب صاحب کے سامنے کیا تھا کہ ان کی نئی ملازمہ کے پیٹ میں جو بچہ پل رہا ہے وہ اسی کا ہے۔

حالاں کہ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ نئی ملازمہ اکثر راتوں میں تاج محمد کی کوٹھری میں نہیں جاتی تھی بلکہ چھوٹے نواب صاحب کی خواب گاہ میں آتے جاتے بہت سوں نے دیکھا تھا۔ صرف چھوٹے نواب صاحب کو بدنامی سے بچانے کے لیے تاج محمد نے اس الزام کو اپنے سر لیا تھا، ورنہ اس نے تو نئی ملازمہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

اس ناکردہ گناہ کی پاداش میں اسے نواب صاحب کی کوٹھی سے نکال دیا گیا۔ کئی برسوں تک وہ کوٹھی سے دور رہا۔ لیکن جب چھوٹے نواب صاحب بڑے نواب بن گئے تو انہوں نے تاج محمد کو پھر ملازم رکھ لیا۔

تاج محمد نے ملازمت میں آنے پر جب پہلی مرتبہ کوٹھی میں قدم رکھا تو اسے معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی شادی نواب نجم الدین کی اکلوتی لڑکی رقیہ بیگم سے ہو چکی ہے۔

نواب صاحب اس عمر کو پہنچنے کے بعد جتنے بے ڈول ہو گئے تھے رقیہ بیگم اتنی ہی دیدہ زیب اور دلکش نظر آتی تھیں جتنی کہ وہ پہلے نظر آتی تھیں۔ دو بچوں کو جنم دینے کے بعد ان کا جسم بے شمار عورتوں کے جسموں سے الگ تھلگ تھا جو ایک ہی بچہ کو جنم دینے کے بعد صابن کے جھاگ کی مانند بیٹھ جاتی ہیں۔

لیکن ایسی بیوی پانے کے بعد بھی نواب صاحب اپنی حد سے بڑھی ہوئی عاشق مزاجی کی وجہ سے غیر مطمئن تھے۔

سرور کی ایک دوسری لہر نے نواب صاحب کو پھر جھنجھوڑ دیا۔ ہوش میں آتے ہی انہوں نے ایک جام اور پیا، پھر سگریٹ سلگائی اور آرام کرسی سے ٹیک لگا کر کش لینے لگے تھے۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رقیہ بیگم کے لوٹ آنے کی امید بہت کم تھی۔

"ہوں۔" نواب صاحب نے نشے میں جھومتے ہوئے کہا "محبت بھی کیا چیز ہوتی

ہے۔ انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے اور اس کو کسی بات کا خیال نہیں رہتا۔"

"ہاں سرکار!" تاج محمد نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے حامی بھری۔

"جب ہمیں جوانی میں شاہدہ سے محبت ہوئی تو ..."

نواب صاحب نے اپنی پہلی محبت کا ذکر کرنا چاہا۔ لیکن پھر سوچ کر انہوں نے کہا:

"نہیں پہلے تم سناؤ۔ تم نے کس سے محبت کی؟"

"نہیں حضور! پہلے آپ سنائیے۔" تاج محمد نے ٹالنا چاہا۔

"پہلے ہم تمہاری داستان سنیں گے، پھر ہم سنائیں گے۔ سناؤ۔" نواب صاحب کے لہجے میں تحکم تھا۔

"جی!" تاج محمد کو اپنی داستان طوعاً و کرہاً سنانا ہی پڑی۔

"حضور! جب میں بیس سال کا تھا جب ایک لڑکی کو دیکھ کر دل پر قابو نہیں رہا۔ وہ لڑکی روزانہ ہماری گلی سے ہو کر اسکول جایا کرتی تھی۔ وہ بڑے گھرانے کی لڑکی تھی حضور۔ لیکن تھی بہت خوب صورت سرکار۔ میں تو جب بھی اس کو دیکھتا خود کو بھول جاتا۔ بس سرکار!"

اتنا کہہ کر تاج محمد نے اپنے ہاتھ ایسے جوڑ دیے جیسے ماضی میں اس سے بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا تھا جس کا آج اس نے کھلے بندوں اقرار کر لیا ہو۔

"پھر تم نے کس سے محبت کی؟" نواب صاحب نے پھر پوچھا۔

"پھر — ؟"

"ہاں پھر — ؟"

"پھر مجھے اس لڑکی سے محبت ہو گئی۔" تاج محمد بولا۔

"جس نے محبت میں اپنی جان دے دی۔"

"جان دے دی؟" نواب صاحب نے پوچھا۔

"ہاں سرکار!"

"کون تھی وہ؟" نواب صاحب کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"اس کا نام میمونہ تھا سرکار۔" تاج محمد نے کہنا شروع کیا۔ "ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ اس کی ہنسی بہت اچھی تھی سرکار۔ جب وہ ہنستی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔ بڑی دل بستگی تھی اس کی ہنسی میں، جیسے نقرئی سکوں کو کوئی اچھال دے۔ جھرنوں کی مترنم آواز کی مانند!

محلے والوں کی نظروں سے ہماری محبت چھپ نہ سکی۔ اس کے باپ کو بھی علم ہو گیا۔ ہماری ملاقاتوں پر بھی پابندیاں لگ گئیں۔ ہمارے لبوں پہ تالے لگا دیے گئے۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھنے سے ترس گئے۔ اور ایک دن میمونہ کے باپ نے اسے مجھ سے دُور رکھنے کے لیے اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جس نے میمونہ کے لبوں سے ہمیشہ کے لیے ہنسی چھین لی۔

کہتے ہیں کہ انسان جتنا زیادہ ہنستا ہے اتنا ہی زیادہ اسے رونا پڑتا ہے۔ میمونہ کی شادی ہوتے ہی جیسے ہمارے رونے کے دن آ گئے۔

جب بھی مَیں میمونہ کے بارے میں سنتا یہی سنتا کہ وہ روتی رہتی ہے۔ وہ بہت روتی ہے، جب دیکھو وہ روتی ہی رہتی ہے۔ جانے اس کو کیا ہو گیا تھا۔ جیسے اسے رونے کی بیماری لگ گئی ہو۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ روتے روتے اپنی جان دے دے گی۔

اس کی یاد آتے ہی مَیں بھی رونے لگتا۔ روتے روتے میرے آنسو خشک ہو گئے۔ لیکن اس کی یاد نے میرا تعاقب نہ چھوڑا۔ روز روز کے رونے سے تنگ آ کر میمونہ کے خاوند نے اسے طلاق دے دی۔

لیکن یہ طلاق میمونہ کو اس وقت دی گئی جب اس میں رونے کی طاقت نہ رہی، اور نہ ہنسنے کی۔ اور اس سے پہلے کہ ہم ایک دوسرے کو ہنسا سکتے کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسے مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا، اور مجھے اس بے درد دُنیا میں بلکنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا۔

اس کے مرنے کے بعد میری ہنسی تو کافور ہو گئی۔ مَیں لوگوں کو ہنستے ہوئے دیکھتا ان

کو روتے ہوئے دیکھا، لیکن مجھ کو ہنسی آتی نہ رونا۔ پھر میں نے کسی اور سے محبت نہیں کی۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ میری محبت پاک تھی۔"

"اس لیے ..... میں آج تک میمونہ کو نہ بھلا سکا...." نواب صاحب کی بیوی رقیہ بیگم کی آواز پر نواب صاحب اور تاج محمد دونوں چونک پڑے۔

رقیہ بیگم سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ نہ جانے وہ کب سے ان کے نزدیک خاموش کھڑی ہوئی تاج محمد کی داستان سُن رہی تھیں۔ ابھی ان کی حیرت دُور نہیں ہوئی تھی کہ رقیہ بیگم قریب آئیں اور کہنے لگیں:

"کیوں تاجو! یہی ہے نا وہ بات۔ جو تم کہنا چاہتے تھے؟"

یہ کہتی ہوئی وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔

تاج محمد نے ان کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا "یہ بات نہیں ہے۔"

نواب صاحب نے پوچھا "تو پھر کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں" تاج محمد بولا۔ "میں تو کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا۔"

"کیا تم کو میمونہ کی یاد نہیں آتی؟" رقیہ بیگم نے پوچھا۔ "جس نے تمہارے لیے جان دے دی۔"

"نہیں ـــــ"

"کیوں ـــــ؟"

"اس لیے کہ وہ تو ایک کہانی تھی، جو کہ میں نے نواب صاحب کے کہنے پر سنائی تھی، لیکن ...."

"لیکن کیا ـ؟" رقیہ بیگم نے پوچھا۔

"کہانی کی محبوبہ اتنی یاد نہیں آتی جتنی کہ وہ لڑکی یاد آتی ہے جس کو میں روز اسکول آتے جاتے دیکھتا تھا۔ وہ برقعے میں روز اسکول جایا کرتی تھی۔ لیکن ایک دن میں نے اسے

بغیر برقعے کے بھی دیکھ لیا تھا۔"

اتنا کہہ کر تاج محمد اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا سرکار! اب میں چلتا ہوں، رات بہت ہوگئی۔"

نواب صاحب بولے:

"ٹھہرو تاجو۔ جانے سے پہلے اتنا تو بتادو کہ تمہیں کس سے محبت تھی؟ میمونہ سے، یا اس لڑکی سے جس کو تم اسکول آتے جاتے دیکھتے تھے؟"

"صرف ایک سے!" تاج محمد نے جواب دیا۔ "جس پر آج تک میں یہ ظاہر نہ کرسکا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔"

"کس سے؟ کچھ بتلاؤ تو سہی۔ تم کس سے محبت کرتے ہو؟" نواب صاحب نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

تاج محمد رُکتے رُکتے بولا:

"اس اسکول والی لڑکی سے ـــــ جس کو دیکھ کر میں اپنے ہوش وحواس کھو دیا کرتا تھا۔"

"کیا وہ لڑکی زندہ ہے؟" رقیہ بیگم نے اشتیاق سے پوچھا۔

"کیا تم نے کبھی اس سے بات کی ہے؟"

"ہاں سرکار!" تاج محمد نے برآمدے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"تاجو ٹھہرو!" نواب صاحب کرسی پر بیٹھ گئے "کیا نام ہے اس کا بتاتے جاؤ۔"

"سرکار! یہ نہ پوچھیے۔"

"کیوں؟" رقیہ بولیں "کیا اس لڑکی کی شادی ہوگئی؟"

"جی ہوگئی ـــــ" تاج محمد نے برآمدے کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے جواب دیا۔

"اور نام؟" رقیہ بیگم نے بے تابی کے ساتھ پوچھا "بتاؤ تاجو، تمہیں ہماری قسم!"

بیگم صاحبہ کے قسم دینے پر بے ساختہ تاج محمد کے منہ سے نکل گیا :

" ..... ر .... قیّہ ... با ــــ ! کوئی اور نہیں - وہ آپ ہی ہیں "

اتنا سنتے ہی رقیّہ بیگم کرسی پر سے ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں ، جیسے انہیں بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو - نواب صاحب کا نشہ ہرن ہو گیا -

اس سے پہلے کہ وہ دونوں اپنے حواس پر قابو پاتے تاج محمد کوٹھی سے باہر نکل گیا - خاموش نظروں کے ساتھ وہ اسے جاتا دیکھتے رہے -

اس کے بعد ـــــ

نہ ہی تاج محمد لوٹ کر کوٹھی میں آیا اور نہ ہی نواب صاحب نے بھول کر کسی کے سامنے اپنی بے شمار محبتوں کا ذکر کیا - اور نہ تاج محمد کو کسی نے بتلایا کہ اس کے بعد رقیّہ بیگم کبھی ہنستی ہوئی دیکھی گئیں -

●●

خون پھر خون ہے

رقیہ بیگم مسہری پر بے چینی کے ساتھ کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی تھیں مگر انہیں کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔

ایک طوفان سا ان کے دل و دماغ میں مچا ہوا تھا کہ وہ کیا کریں؟ کس طرح ان کو سکون نصیب ہوگا؟ اپنی جان دے کر یا پھر کسی کی جان لے کر ۔۔ ؟

بات ہی ایسی تھی کہ جس سے ان کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر کروٹ بدلی۔ لیکن ان کی بے چینی میں رتی بھر بھی کمی نہیں ہوئی۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"یا اللہ ۔۔ کیا آج کی رات مجھے ایک پل کے لیے بھی آرام نہیں ملے گا؟ کیا ساری رات کانٹوں پر ہی بسر کرنا ہوگی؟" وہ آپ ہی آپ بڑبڑائیں اور سونے کی کوشش کرنے لگیں، مگر ان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی، جو انہیں اور زیادہ بے چین کر گئی ۔۔ انہوں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

آج کی رات کاٹنا مشکل ہے ۔۔ رقیہ بیگم نے سوچا ۔۔ رات گزر جائے بھی تو کیا دل میں جو کانٹا چبھ گیا ہے وہ بھی نکل جائے گا؟ کس طرح وہ اپنے دل میں کانٹے کی چبھن کو دور کر دیں جو ان کے پورے وجود میں ایک ہلچل مچائے ہوئے ہے۔

بڑھتی ہوئی بے چینی کو دور کرنے کے لیے رقیہ بیگم نے بہت کچھ سوچا، کئی طرح سے دل کو سمجھایا، مگر کسی طرح ان کو قرار نہ ملا۔ انہوں نے پھر کروٹ بدلی۔ سامنے کھلی ہوئی کھڑکی میں سے چاند صاف نظر آ رہا تھا ۔ چاند ۔۔ شاید یہ چودھویں کا تھا، اور رات

—— شاید پونم کی تھی۔ جب تو چاندنی اتنی دلکش اور رات اتنی پیاری تھی کہ ہر طرف ایک سحر سا چھایا ہوا تھا۔ اور اس سحر میں آس پاس رہنے والے سبھی میٹھی نیند سوئے ہوئے تھے۔ صرف ایک رقیہ بیگم جاگ رہی تھیں۔

کھڑکی سے نیچے گلی میں کوئی نہیں آ رہا تھا۔ ان کی کوٹھی میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ رقیہ بیگم کو اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی ان کے دل و دماغ پر کوڑے برسا رہا ہو۔

ایک ہی پہلو پر لیٹے رہنا، ان کے لیے دو بھر ہو گیا۔ گھبرا کر انہوں نے پھر کروٹ بدلی۔ سامنے مسہری کے نزدیک نواب مختار الدین نشہ کی حالت میں چور پڑے ہوئے تھے۔

اپنے شوہر کو اس حالت میں دیکھ کر رقیہ بیگم کے دل میں نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ایک دم غصہ میں بھر گئیں اور ان کا جی چاہا کہ وہ اٹھیں اور مختار الدین کے پاس جائیں اور ان کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھیں —— کہ آخر میں نے کیا کیا تھا جس کی تم نے مجھے یہ سزا دی؟ کیوں تم نے میرا صبر و سکون چھین لیا، بتاؤ؟ —— اور اگر نواب مختار الدین ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیں، تو پھر دیوار پر لگی ہوئی بندوق کو نواب صاحب کے سینے پر خالی کر دیں تاکہ ان کو کچھ تو سکون ملے۔

مگر وہ چاہتے ہوئے بھی مسہری سے اٹھ نہ سکیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے اپنے شوہر کو تکتی رہیں، جو شراب کے نشے میں اتنے بے سدھ پڑے ہوئے تھے کہ ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ وہ رقیہ بیگم کے دل کے درد کو کیا جانتے؟

رات کے سناٹے میں لیٹے ہوئے رقیہ بیگم کی دلی کیفیت کچھ عجیب سی ہو چلی تھی، ان کے سارے بدن میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ ان کے ذہن میں خیالات کا سیال مادہ ابل رہا تھا، جو ان کے جذبات و احساسات میں آگ سی لگا رہا تھا۔

کبھی تو انہیں نواب مختار الدین کی صورت بری لگتی اور کبھی نواب صاحب کا وجود انہیں بہت پیارا لگتا —— انہوں نے نواب مختار الدین پر ایک نظر ڈالی۔ نشہ میں مدہوش پڑے

ہوئے نواب صاحب رقیہ بیگم کو کچھ بھلے لگے۔ انہیں کچھ ایسی باتیں یاد آنے لگیں جس سے ان کے پورے جسم میں شہد سا گھل گیا۔ لیکن دوسرے لمحے اس شہد نے زہر کی شکل اختیار کر لی۔ اور وہ ان کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ انہیں اپنا گلا سوکھتا ہوا محسوس ہوا۔

پیاس کی شدت دور کرنے کے لیے وہ مسہری سے اٹھیں اور صراحی سے انہوں نے ایک گلاس پانی بھرا اور ایک ہی سانس میں اسے خالی کر دیا۔ انہیں اپنے سینے میں ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ایک گلاس سے پیاس نہ بجھی تو انہوں نے دوسرا گلاس بھرا اور اس کو بھی ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

کچھ دیر وہ صراحی کے پاس بیٹھی رہیں۔ ان کا ایک ہاتھ صراحی کی گردن پر تھا، اور صراحی کی ٹھنڈک انہیں اپنے دل میں محسوس ہونے لگی۔ کچھ اور زیادہ سکون پانے کے لیے انہوں نے صراحی پر ہاتھ پھیرا۔ اور سکون سا محسوس کیا۔

جب انہیں قدرے سکون ہوا تو انہیں سامنے ہی دیوار پر آئینہ لگا ہوا دکھائی دیا۔ کمرے کی ہلکی روشنی میں انہوں نے اپنا عکس دیکھا۔ انہیں اپنے چہرے پر غم کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ گھبرا کر آئینہ کے سامنے سے وہ ہٹ گئیں۔

برآمدے میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ برآمدے میں ایک طرف دو تین کرسیاں اور ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ میز پر ایک دو خالی بوتلیں اور ایک گلاس پڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر تو وہ میز کے پاس خاموش کھڑی رہیں، پھر وہ اس کمرے میں گئیں جہاں ان کے دونوں بچے آرام سے سوئے ہوئے تھے۔ خاموش کھڑی وہ دونوں کو دیکھتی رہیں، پھر وہ آ کر اپنے کمرے میں مسہری پر لیٹ گئیں، اور سونے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔ نیند ــــ جس نے آج نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی، اب بھی ان کی آنکھوں سے دور ہی تھی۔

خیالات کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ دفعتاً انہیں اپنا میکہ یاد آنے لگا... جو اسی شہر میں تھا۔

رقیہ بیگم کو سب سے پہلے اپنے والد نواب نجم الدین یاد آئے جن کا تعلق بھی اسی نواب خاندان سے تھا جس خاندان سے نواب مختار الدین کا تھا۔ اور وہ تھا نواب وقار الدین کا خاندان۔ جس نے آگے چل کر دو خاندانوں کی شکل اختیار کرلی تھی۔ ایک نواب افتخار الدین کا اور دوسرا نواب نجم الدین کا ـــــ دونوں چچیرے بھائی تھے۔

ایک زمانہ تھا کہ وہ سب ایک ہی کوٹھی میں رہتے تھے مگر جب نواب نجم الدین نے اپنے خاندان سے باہر شادی کرلی تو نواب افتخار الدین سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے نواب نجم الدین کو بہت سخت سست کہا جس سے دل برداشتہ ہوکر نواب نجم الدین نے نواب کوٹھی ہی چھوڑ دی اور الگ مکان لے کر رہنے لگے۔

کوٹھی چھوڑ دینے کے بعد نواب نجم الدین نے اپنی جاگیر بھی الگ کرلی اور اس کی دیکھ بھال بھی خود ہی کرنے لگے۔ کچھ سال بعد دونوں بھائیوں میں صلح ہوگئی۔ لیکن نواب نجم الدین نے دوبارہ لوٹ کر کوٹھی میں آنا پسند نہیں کیا۔

نواب نجم الدین تمام باتوں میں اپنے چچیرے بھائی سے بہت مختلف تھے، صورت شکل میں بھی اور عادات واطوار میں بھی ـــــ نہ تو انہیں اپنے بہت زیادہ خوب صورت ہونے پر ناز تھا اور نہ ہی اپنے اعلیٰ خاندان ہونے کی پرواہ تھی۔ وہ خود کو نواب کہلوانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ جب بھی کوئی ان کو "نواب صاحب" کہتا تو وہ کہا کرتے کہ نواب تو وہ ہے جس کے پاس کوٹھی ہو، اپنے پاس تو سر چھپانے کے لیے جھونپڑا ہے۔

کوٹھی نواب افتخار الدین کے پاس تھی، اس لیے لوگ انہیں "کوٹھی والے نواب صاحب" کہنے لگے۔ خود نواب نجم الدین جب کبھی ان کا ذکر کرتے تو کہا کرتے کہ کوٹھی والے نواب کے پاس جاؤ وہ تم کو نواب خاندان کے کارنامے سنائیں گے۔

نواب نجم الدین کی پہلی شادی تو نواب خاندان کی ایک لڑکی سلطانہ بیگم سے ہوئی تھی، مگر کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے اپنی مرضی سے زبیدہ بانو سے شادی رچالی جس سے

نواب کوٹھی ہی میں نہیں بلکہ پورے شہر میں تہلکہ مچ گیا۔ اور نواب افتخارالدین کو اپنے خاندان کی عزت مٹی میں ملتی نظر آنے لگی۔ کیوں کہ زبیدہ بانو نواب خاندان کے ایک ملازم کریم بیگ کی لڑکی تھی۔

نواب افتخارالدین کو یہ بات ناپسند تھی کہ ان کے ایک ملازم کی بیٹی نواب خاندان کی بہو کہلائے۔ انہوں نے بہت چاہا کہ نواب خاندان میں باہر کا خون شامل نہ ہونے پائے۔ مگر نہ جانے نواب نجم الدین پر زبیدہ نے کیا جادو کر دیا تھا کہ انہوں نے کسی کی ایک بات نہ مانی۔ شادی کے بعد انہوں نے نواب کوٹھی بھی چھوڑ دی۔

اور لوگوں کی طرح نواب افتخارالدین کا بھی یہی خیال تھا کہ جوانی کا نشہ اتر جانے کے بعد نواب نجم الدین اپنی غلطی کو تسلیم کر لیں گے اور زبیدہ بانو کو چھوڑ دیں گے۔ مگر نواب نجم الدین نے مرتے دم تک زبیدہ کو نہیں چھوڑا۔ سلطانہ بیگم بھی انہیں کے پاس رہتی تھیں۔

اولاد نرینہ تو دونوں بیویوں میں سے کسی کو نہ ہوئی، لیکن زبیدہ بانو نے قدسیہ بانو کو اور سلطانہ بیگم نے رقیّہ بیگم کو جنم دیا۔ قدسیہ بانو کی عمر جب آٹھ سال کی تھی تو ان کی والدہ زبیدہ بانو کا انتقال ہو گیا۔

نواب نجم الدین نے زبیدہ بانو کے مرجانے کے بعد ان کی آخری نشانی قدسیہ کو اپنے سے الگ نہیں کیا۔ اور نہ ہی قدسیہ اور رقیہ میں انہوں نے کبھی امتیاز برتا۔

نواب نجم الدین کی یاد جب کم ہوئی تو رقیّہ بیگم کو قدسیہ بانو کی یاد ستانے لگی، جو ان کی سوتیلی بہن تھیں۔

لوگ کہا کرتے تھے کہ جس طرح زبیدہ بانو نے نواب نجم الدین پر جادو کر دیا تھا، ویسا ہی جادو قدسیہ بیگم نے رقیّہ پر کر دیا ہے۔ جب دیکھو وہ اس کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ کچھ بزرگوں کو اندیشہ بھی تھا کہ قدسیہ کے ساتھ رہ کر رقیّہ بھی خراب ہو جائے گی۔ نہ لکھے گی نہ

پڑھے گی اور نہ ہی اس کی وجہ سے اس کی شادی کسی اچھے گھرانے میں ہو گی۔ اس لیے رقیہ کو قدسیہ کے ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔

مگر بزرگوں کی باتوں کا نہ تو قدسیہ بانو پر کبھی اثر ہوا اور نہ کبھی رقیہ بیگم ان کو خاطر میں لائیں۔ دونوں ساتھ ہی کھیلتیں، ساتھ ہی اسکول جاتیں اور ساتھ ہی کھاتیں، دونوں میں لگاؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک دوسرے کے بغیر دونوں کو قرار نہیں آتا تھا۔

کچھ بزرگوں نے یہ حال دیکھ کر نصیحتیں کرنا ترک کر دیا۔ مگر وہ بزرگ جنہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور جو اڑتی ہوئی چڑیا کے پر گن لیا کرتے تھے، اب بھی وقت بے وقت رقیہ بیگم کے والدین کو آگاہ کیا کرتے تھے:

"دیکھ لینا ——— یہ خون ایک دن رنگ لا کر رہے گا۔"

یہ باتیں سُن سُن کر سلطانہ بیگم گہری سوچ میں پڑ جاتیں۔ مگر نواب نجم الدین کبھی ان باتوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ جب بھی کوئی ان کے سامنے اس قسم کی باتیں کرتا تو وہ کہتے:

"یہ وہ خون نہیں جو رنگ لائے۔"

نواب نجم الدین صاحب سے یہ جواب سُن کر وہ لوگ خاموش ہو جایا کرتے۔

لیکن اس دن کسی نے خاموشی اختیار نہیں کی۔ ہر ایک نے ایک ایک منہ ہزار باتیں کیں۔ جب نواب نجم الدین کے گھر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ ہر طرف سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نواب نجم الدین اپنے کمرے میں سر جھکائے ہوئے غمگین بیٹھے ہوئے تھے اور رقیہ بیگم پچھاڑیں مارتی ہوئی رو رہی تھیں، کیوں کہ ان کی پیاری بہن قدسیہ بانو نے زہر کھا لیا تھا۔

"قدسیہ بانو نے کیوں زہر کھا لیا؟"

یہی سوال ہر شخص کی زبان پر تھا۔ مگر جواب ——— کسی کے پاس نہ تھا۔

جواب دینے والی قدسیہ بانو تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

جان سے زیادہ عزیز بہن کے زہر کھا لینے سے رقیہ بیگم کو جتنا دکھ ہوا تھا۔ اس سے زیادہ انہیں دکھ اس بات کا تھا کہ قدسیہ بانو نے انہیں وہ بات نہیں بتائی جس کی وجہ سے اس نے زہر کھا لیا تھا۔ حالاں کہ وہ رقیہ بیگم سے کوئی بات چھپاتی نہیں تھی۔ اپنے دل کا ہر راز انہیں بتا دیا کرتی تھی۔ پھر اس نے زہر کیوں کھا لیا؟

اس سوال نے رقیہ بیگم کو کئی دن تک پریشان رکھا.... پھر ان کی شادی نواب مختارالدین سے ہو گئی۔

یہ شادی اتنی دھوم دھام سے ہوئی کہ رقیہ بیگم، قدسیہ بیگم کو بھلا بیٹھیں، جب وہ دلہن بن کر نواب کوٹھی میں آئی تھیں تو یہ کوٹھی کتنی جگ مگا رہی تھی۔ ایک دلہن کی طرح کوٹھی کو سجایا گیا۔ رات پر دن کا گمان ہوتا تھا۔

رقیہ بیگم کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب انہوں نے ڈولی سے اتر کر پہلا قدم کوٹھی میں رکھا تھا تو نواب افتخارالدین نے کتنی جھولیاں بھر روپے لٹائے تھے۔

یہ یاد کرتے ہی چھن چھن کی آواز ان کے کانوں میں گونجنے لگی۔ انہیں اپنے چاروں طرف روپے برستے دکھائی دینے لگے اور اسی روپیوں کی بارش میں انہیں نواب مختارالدین کا چہرہ نظر آنے لگا۔

نواب مختارالدین کا چہرہ ان کے لیے اجنبی نہ تھا۔ وہ ان کو اس سے پہلے کئی مرتبہ اس کوٹھی میں اور اپنے مکان پر دیکھ چکی تھیں۔ مگر وہ اس دن انہیں کس قدر خوب صورت نظر آئے تھے کہ رقیہ بیگم کو اپنی قسمت پر رشک آنے لگا تھا۔

جب نواب صاحب نے حجلۂ عروسی میں ان کا گھونگھٹ اٹھایا تھا تو وہ نظریں نیچی کرنے کے بجائے انہیں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی تھی۔ اور اس دن سے وہ اتنے بھلے لگے کہ نواب صاحب کو دیکھے بغیر انہیں چین ہی نہیں آتا۔ ایک منٹ کے لیے بھی اپنے آپ سے جدا ہونے نہ دیتیں۔

شادی کے بعد رقیہ بیگم کو کچھ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ نواب صاحب کو کیا کیا شوق

ہیں؟ لیکن دھیرے دھیرے ان پر بہت سے راز کھلنے لگے۔ نواب صاحب پیتے بھی ہیں، نواب صاحب تاش بھی کھیلتے ہیں، نواب صاحب طوائفوں کے کوٹھوں پر بھی جاتے ہیں اور۔۔۔ اور۔۔۔ وہ بڑے عاشق مزاج بھی ہیں۔

نواب مختار الدین کے عشقیہ چرچے سُن سُن کر رقیہ بیگم کا خون کھولنے لگتا، مگر جب بھی وہ نواب صاحب سے کچھ کہتیں تو ہنس کر ٹال دیتے اور کہتے:

"رقّو! ۔۔۔ تم نے غلط سُنا ہے ۔۔۔ مجھے تو صرف تم سے پیار ہے۔"

اور جب رقیہ بیگم پینے پلانے کی بات چھیڑ دیتیں تو صرف دبی زبان سے اقرار کرتے:

"دوستوں کے مجبور کرنے پر ایک آدھ گھونٹ پی لیتا ہوں۔"

اس اقرار پر رقیہ بیگم کو غصّہ تو بہت آتا۔ مگر وہ زبان سے کچھ نہ کہتی تھیں، کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ ان کے لاکھ منع کرنے پر بھی نواب صاحب پینا نہیں چھوڑ سکتے ۔۔۔ انہیں پینے کی لت پڑ چکی تھی۔

اور اس وقت تو لت اور بڑھ گئی جب کوئی ٹوکنے والا نہیں رہا۔ بڑے نواب صاحب کے مرنے کے بعد جب نواب مختار الدین "پورے" نواب بن گئے تو وہ کوٹھی میں بیٹھ کر رقیہ بیگم کے سامنے پینے لگے۔

جب یہ پردہ بھی اُٹھ گیا تو وہ خود نشے کی حالت میں اپنی بے شمار محبّتوں کے قصّے سُنانے لگتے۔ لیکن رقیہ بیگم کو کبھی ان قصّوں سے جلن پیدا نہیں ہوئی، کیوں کہ اپنی حد سے بڑھی ہوئی عاشق مزاجی کے باوجود بھی وہ رقیہ بیگم کو کتنا چاہتے تھے، یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ ایک بات کا احساس رقیہ بیگم کو اچھی طرح ہو گیا تھا کہ نشے کی حالت میں نواب صاحب یا تو ان سے محبّت جتلانے لگتے یا پھر اپنی بے شمار محبّتوں کی محبوباؤں سے۔

رقیہ بیگم کو کبھی تو محسوس ہوتا کہ ان کی بہت سی سوکنیں ہیں۔ اور کبھی یہ خیال پیدا ہوتا کہ نواب صاحب کو ان سے زیادہ محبّت کسی اور سے نہیں ہے ۔۔۔ اور کبھی تو انہیں ایسا لگتا کہ بس

یہ ایک نشہ ہے، اور کچھ نہیں!

یہی سوچتے سوچتے اور خیال کرتے کرتے زندگی گزرنے لگی۔ اولادیں پیدا ہونے لگیں۔ اور جب وہ کوٹھی کی بیگم صاحبہ بن گئیں تو زندگی ایک ڈھرّے پر لگ گئی۔ نواب صاحب روز پیتے اور وہ دیکھتی رہیں۔ ان کی پیار بھری باتیں سنتی رہیں۔ نہیں سُنا جاتا، تو اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتیں اور تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر سو جاتیں۔

مگر آج ۔۔۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ جتنی وہ سونے کی کوشش کر رہی تھیں، نیند ان کی آنکھوں سے اتنی ہی دُور ہوتی جا رہی تھی۔ آج ان کے چاہنے پر بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ ان کے تن بدن میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی جو انہیں سونے نہیں دے رہی تھی۔

یوں تو رقیہ بیگم بے چین اسی رات سے تھیں جس رات تاج محمد نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ وہ ان سے پیار کرتا ہے۔ تاج محمد نے اس بات کا اقرار نواب مختار الدین کے پوچھنے پر ہی کہا تھا۔ اس رات نواب صاحب پر تاج محمد کی داستانِ محبت سننے کی ضد سوار ہو گئی تھی۔ مجبوراً تاج محمد کو اپنی محبت کا اقرار کرنا پڑا تھا، لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ تاج محمد اُن سے محبت کرتا ہے اور اس کا اقرار نواب صاحب کے سامنے کرے گا۔

جب اس نے یہ بات کہی تھی تو رقیہ بیگم کو ایسا لگا تھا کہ نواب مختار الدین جو اپنے غصّے کے لیے مشہور ہیں تاج محمد کو ضرور گولی مار دیں گے۔ لیکن خلافِ توقع وہ کچھ نہ بولے ... خاموش بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ تاج محمد اپنی گستاخی کی کوئی سزا پائے بغیر کوٹھی چھوڑ کر چلا گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی نواب صاحب نے اپنا غصّہ ظاہر نہیں کیا اور اسی دن سے رقیہ بیگم کو یہ خوف کھانے لگا کہ یہ غصّہ ایک نہ ایک دن آتش فشاں بن کر پھوٹے گا۔

اس دن کے بعد سے نواب مختار الدین کچھ بجھے بجھے سے رہنے لگے۔ ایک اُداسی ان کے چہرے پر چھائی رہتی۔ اور اب نہ پہلے کی طرح پیتے وقت وہ اپنی محبتوں کا ذکر کرتے اور نہ

ہی رقیہ بیگم سے محبت جتلاتے۔ بس خاموش جام پر جام چڑھایا کرتے۔

رقیہ بیگم سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں جاتا۔ وہ چاہتی تھیں کہ نواب صاحب کا غصّہ کسی نہ کسی طرح فرو ہوجائے۔ یا تو وہ اس کا اظہار کردیں یا پھر وہ اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دیں۔

لیکن آج وہ خود آتش فشاں پہاڑ بن گئی تھیں۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ نواب صاحب کا گلا گھونٹ دیں۔ بات ہی ایسی تھی جس نے ان کے دل کا صبر و سکون چھین لیا تھا۔ جتنا غصّہ انہیں نواب صاحب پر تھا اتنا ہی غصّہ اپنے آپ پر بھی تھا۔ وہ بات جسے سن کر ان کے ہوش و حواس اڑ گئے تھے، انہوں نے خود آگے رہ کر نواب صاحب سے پوچھی تھی۔

ہُوا یوں تھا کہ نواب مختارالدین اس دن بہت اُداس تھے۔ رقیہ بیگم کو ان کی اُداسی کچھ اچھی نہیں لگی اور وہ اپنے دونوں بچّوں کو جلد سُلا کر ان کے پاس جا بیٹھیں۔ نواب صاحب اپنی عادت کے مطابق پینے میں مشغول تھے۔

"آج آپ بہت اُداس ہیں؟" رقیہ بیگم نے پوچھا۔

نواب صاحب نے مختصر جواب دیا:

"نہیں تو ...."

"ایسا لگتا ہے کہ آپ آج تک تاج محمد کی بات بھولے نہیں۔" رقیہ بیگم نے آگے رہ کر بات چھیڑی۔

جام بناتے ہوتے نواب صاحب نے پوچھا:

"کون سی بات؟"

"یہی کہ ــــ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"کرتا ہے تو کرنے دو۔" ہونٹوں سے جام لگاتے ہوئے نواب صاحب نے کہا۔

"میں کسی کو محبت کرنے سے کب روکتا ہوں؟"

"پھر آپ اُداس کیوں ہیں؟" رقیہ بیگم نے پھر پوچھا۔

"مَیں اُداس کہاں ہوں؟"

"آپ اُداس نہیں ہیں تو پھر کیا بات ہے؟" رقیہ بیگم بولیں: "آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"

"نہیں تو۔" نواب صاحب نے جواب دیا۔

"پھر آپ کی محبت میں وہ پہلی سی شدت کیوں نہیں رہی؟" رقیہ بیگم نے پوچھا۔

نواب صاحب نے جواب دیا:

"مَیں اب بھی تم سے پیار کرتا ہوں۔"

رقیہ بیگم بولیں:

"جھوٹ مت بولیے۔ مَیں دیکھ رہی ہوں اب آپ کی نظروں میں وہ پیار نہیں، جو پہلے تھا۔"

"مَیں سچ کہہ رہا ہوں۔" نواب صاحب نے کہا "مجھے آج بھی تم سے پیار ہے۔"

مگر رقیہ بیگم کو یقین نہیں آیا۔ وہ بضد رہیں کہ نواب صاحب کے رویّے میں ضرور فرق آگیا ہے۔

"آپ سمجھتے ہیں کہ مَیں بھی .... " وہ رُکتے رُکتے بولیں " .... در پردہ تاج محمد سے محبت کرتی ہوں۔"

"مَیں نے یہ کب کہا؟" نواب صاحب نے کہا۔ "اور نہ ہی میں ایسا سوچتا ہوں۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"پھر آپ اُداس کیوں رہتے ہیں؟" جھنجھلا کر رقیہ بیگم نے پوچھا۔

"اُداس — کہاں رہتا ہوں؟"

"بتا دیجیے۔" رقیہ بیگم روہانسی ہو کر بولیں۔ "خدا کے لیے بتا دیجیے۔ آپ

کو کیا غم ہے ورنہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

"کیا بتا دوں؟" نواب صاحب نے عاجز آکر پوچھا۔ "آج تم ضد پر کیوں آمادہ ہو؟"

"آج میں پوچھ کر ہی دم لوں گی۔" رقیہ بیگم بولیں: "آپ کو بتانا پڑے گا۔ اب مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا۔ یا تو بتلا دیجیے یا پھر اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیجیے تاکہ قصہ ختم ہی ہو جائے۔"

"قصہ ۔۔" نواب صاحب نے پوچھا۔ "کون سا قصہ؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے کہ تم کیا پوچھنا چاہ رہی ہو؟"

"آپ کو کیا غم ہے؟" رقیہ بیگم نے پوچھا۔

"کہہ تو رہا ہوں کہ کچھ بھی غم نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟" رقیہ بیگم نے دریافت کیا "میرا دل کہہ رہا ہے ۔ کیا آپ کو اپنی وہ پہلی محبوبہ یاد آرہی ہے جس کا آپ ذکر اکثر کیا کرتے ہیں۔ آپ اس کا نام شاہدہ بتاتے ہیں۔ یاد ہے نا؟"

"یاد ہے" نواب صاحب بولے "لیکن شاہدہ نہیں یاد آرہی ہے۔"

"پھر آپ کو رشیدہ بی کی یاد آرہی ہوگی؟ جس کو اس کے بھائی نے آپ کے ساتھ دیکھ کر قتل کر دیا تھا۔"

"نہیں۔" نواب صاحب نے گلاس کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ کو کون یاد آرہا ہے؟" رقیہ بیگم نے پوچھا۔

نواب صاحب خاموشی سے چسکی لیتے ہوئے شراب پیتے رہے کچھ نہ بولے۔

"بتلائیے نا ۔ پھر آپ کو کس کی یاد آرہی ہے ۔؟"

نواب صاحب نے میز پر گلاس رکھ دیا۔ سگریٹ ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر جلایا۔ کلہ

اس کے کش لگانے لگے۔ کچھ دیر تو رقیہ بیگم نے نواب صاحب کے جواب کا انتظار کیا۔ مگر جب وہ کچھ نہ بولے اور خالی خالی نظروں سے فضا میں گھورنے لگے تو رقیہ بیگم نے پھر بات چھیڑی:

"بتائیے۔ آپ خاموش کیوں ہیں؟"

اس پر بھی نواب صاحب خاموش رہے۔ رقیہ بیگم کو ایسا لگا کہ نواب صاحب کچھ بتلانے کے لیے خود کو تیار کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، انہوں نے گلاس میں بچی ہوئی شراب کو اپنے حلق میں انڈیل لیا اور آنکھیں بند کر کے سگریٹ کے کش لینے لگے۔

رقیہ بیگم کو کچھ اور نہ سوجھا تو انہوں نے شراب کی بوتل میں انڈیلی اور پھر گلاس نواب صاحب کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا:

"لیجیے۔"

نواب صاحب نے آنکھیں کھول کر پہلے گلاس کو اور پھر رقیہ بیگم کی طرف دیکھا جو اُن کی طرف گلاس بڑھا رہی تھیں۔

"دیکھیے۔" رقیہ بیگم بولیں۔ "میں نے کبھی آپ کو شراب پیش نہیں کی لیکن آج کر رہی ہوں۔ صرف اس لیے کہ آپ بتا دیں کہ آپ کو کس کی یاد آ رہی ہے۔"

"بتا دوں۔" نواب صاحب پر نشہ طاری ہونے لگا اور انہوں نے جھومتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

"ہاں۔" رقیہ بیگم نے کہا۔ "بتا دیجیے۔"

نواب صاحب نے گلاس تھامتے ہوئے کہا:

"اس کی یاد آ رہی ہے جس سے میں شادی نہ کر سکا۔"

"کون تھی وہ؟" رقیہ بیگم نے پوچھا۔

"تھی وہ ایک قسمت کی ماری۔" گلاس سے ایک گھونٹ پیتے ہوئے نواب صاحب نے کہا۔ "جو زندگی بھر کا غم دے گئی۔"

رقیہ بیگم بولیں :

"کیوں وہ تمہارے جنگل میں نہیں پھنسی ؟"

"نہیں !"

رقیہ بیگم نے مسکراتے ہوئے پوچھا :

"اور آپ نے اس کی جوانی سے نہیں کھیلا ؟"

"نہیں !"

"میں نہیں مان سکتی کہ آپ اس کو چاہیں اور اس کی جوانی سے نہ کھیلیں ۔" رقیہ بیگم نے کہا ۔

"سچ کہہ رہا ہوں ۔" نواب صاحب نے یقین دلانے کی کوشش کی "میں اسے اس نیت سے ہاتھ بھی نہ لگا سکا ۔"

"کیا وہ بھی آپ کو چاہتی تھی ؟" رقیہ بیگم نے پھر پوچھا ۔

"ہاں ۔"

"تو پھر آپ نے اس سے شادی کیوں نہیں کی ؟"

"میں تو چاہتا تھا مگر ...."

"مگر ؟ ــــ"

"بڑے نواب صاحب کسی طرح بھی راضی نہ ہوئے ۔"

"کیوں ؟" رقیہ بیگم نے پوچھا ۔ "کیا وہ خوبصورت نہیں تھی ؟"

"تھی ــــ مگر اتنی نہیں کہ دنیا والے اسے چودھویں کا چاند کہتے ۔" نواب صاحب بولے ۔ "سانولے رنگ کی تھی وہ ۔ مگر تھی اچھے روپ والی ــــ تیکھی ــــ ہر طرح سے مکمل ــــ بھرپور شباب ــــ اس کے بال بہت اچھے تھے ۔ وہ سراپا اچھی تھی ۔"

"پھر بڑے نواب صاحب نے آپ کو شادی کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی ؟"

رقیہ بیگم نے پوچھا۔

"اس لیے کہ اس میں ایک بُرائی تھی۔"

"کیا بُرائی تھی اس میں؟"

"یہ نہ پوچھو رقو ۔۔۔!" نواب صاحب نے کہا۔

"کیوں؟"

"بتا دوں کو کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

"مگر مَیں آج جان کر ہی دم لوں گی۔" رقیہ بیگم بولیں۔" اب کہاں ہے وہ؟"

"مر گئی ....."

"مر گئی ۔۔!" رقیہ بیگم نے تعجب سے دہرایا۔

"ہاں" نواب صاحب بولے۔" یوں سمجھو اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔"

"کیوں؟"

"اِس لیے کہ بڑے نواب صاحب جس جگہ میری شادی کرنا چاہتے تھے وہ مجھے پسند نہیں تھی۔ اور وہ چاہتی تھی کہ مَیں اس کی خاطر شادی سے انکار نہ کروں۔ اس کے اصرار کے باوجود جب مَیں اپنے فیصلے پر اٹل رہا تو اس نے اپنی خواہش لکھ کر مجھے بھیج دی اور اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔"

"کیا وہ ....." رقیہ بیگم کو اپنے گلے میں کچھ اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔" وہ بھی آپ سے شادی کرنا چاہتی تھی؟"

"چاہتی تھی" نواب صاحب نے کہا۔" مگر اس کے اور میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"کیوں؟"

"کیوں کہ بڑے نواب صاحب کی نظروں میں ہم سے بھی بڑی ایک چیز تھی۔"

"کیا۔؟" رقیہ بیگم نے پوچھا۔

"یہ نہ پوچھو۔" اتنا کہہ کر نواب صاحب نے سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس اٹھائی اور کرسی سے اٹھنے لگے۔

"بتا دیجیے۔ آپ کو ہماری قسم!" رقیہ بیگم موقع ہاتھ سے جاتا دیکھ کر قسمیں دینے لگیں۔ "آپ کو اس کی قسم جس کو آپ چاہتے ہیں۔ بتائیں، محبت سے بڑھ کر کیا چیز نہ تھی؟"

"بتا دوں" نواب صاحب نے پوچھا۔

"ہاں!" رقیہ بیگم بولیں۔ "بتلا دیجیے۔"

نواب صاحب نے کہا:

"خون!"

"خون؟" رقیہ بیگم نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں خون۔" نواب صاحب بولے "بڑے نواب صاحب کو اعلیٰ خون چاہیے تھا۔ اور میں جسے چاہتا تھا وہ اعلیٰ خون نہیں رکھتی تھی۔"

رقیہ بیگم نے پوچھا:

"کیا وہ نیچ ذات کی تھی؟"

"نہیں۔" نواب صاحب نے کہا۔ "تھی دھانی ذات کی... مگر..."

"مگر کیا؟؟"

"یہ کہ اس کی ماں اونچے خاندان سے نہیں تھی۔" نواب صاحب نے کہا۔ "اس لیے نواب صاحب نے ہماری محبت کو پروان چڑھنے نہیں دیا۔"

"مگر اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کیوں کر لیا؟" رقیہ بیگم نے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں شادی کر لوں۔" نواب صاحب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

رقیہ بیگم بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں :

"کس سے ؟"

نواب صاحب نے گلاس کی بچی ہوئی شراب کو ایک ہی سانس میں حلق سے نیچے اتار لیا۔ انہیں کچھ تلخی کا احساس ہُوا۔ سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہ جانے کیسے ان کے منہ سے نکل گیا :

"اس کی چھوٹی بہن سے ــــ رقو تم سے ــــ قدسیہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کی خاطر ــــ تم سے شادی کرنے سے انکار کردوں۔ اس لیے اس نے زہر کھا لیا ۔"

رقیہ بیگم اس سے زیادہ اور کچھ سُن نہ سکیں اور وہ چکرا کر گر پڑیں۔

کچھ دیر بعد ــــ جب وہ ہوش میں آئیں تو نواب صاحب اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ گرتی پڑتی رقیہ بیگم اٹھیں اور جا کر مسہری پر لیٹ گئیں۔

اور جب ہی سے انہیں اپنے کلیجے میں کوئی چیز بری طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جو ان کے پورے وجود میں ایک ہلچل مچائے ہوئے تھی۔ ان کا جی چاہنے لگا کہ وہ چلا چلا کر دنیا والوں کو بتلا دیں کہ قدسیہ بانو ــــ ان کی بڑی بہن نے ــــ کیوں زہر کھا لیا تھا ؟

مگر اس کی سزا وہ کس کو دیں ؟

یہی سوال ان کو بے چین کیے ہوئے تھا ۔

••

پھول کی پتّی، ہیرے کا جگر

"چل بیٹا چل! نواب صاحب کی کوٹھی چلنا ہے۔ وہ کچھ اتنی دور بھی نہیں ہے پاس ہی ہے۔" رحیمو ٹانگے والے نے دونوں ہاتھوں سے گھوڑے کی لگام کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ "تم تو جانتے ہی ہو نا نواب صاحب کو، جن کی کوٹھی آنا وَلی ندی کے کنارے ہے، کھنڈوہ روڈ پر۔ وہیں چلنا ہے بیٹا اپنے کو۔ چلو۔ چال تو دکھاؤ ____ رُکنا تیرا کام نہیں .... چلنا تیری شان .... !"

جیسے گھوڑا رحیم بخش عرف رحیمو کی بات اچھی طرح سمجھتا ہو۔ وہ ہولے ہولے سنسان سڑک پر دوڑنے لگا۔

"آہستہ بیٹے آہستہ۔ اپن کو اتنی جلدی نہیں ہے۔" رحیمو نے اپنے مخصوص انداز میں پچکارا۔ "ہوا بہت مست ہے۔ رات بھی بڑی سہانی ہے اور آج گلاب بھی بڑی ہی غضب کی ملی ہے۔ کیا سرور دے رہی ہے، پوچھو مت۔ ہوا لگتے ہی اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔"

گھوڑے نے رحیم بخش کے ہاتھ کا اشارہ پا کر اپنی چال کچھ دھیمی کر دی۔ فراٹے بھرتی ہوئی کار جب ٹانگے کے پاس سے ہو کر تیزی سے بڑھ گئی تو پھر دہی چٹکی ہوئی چاندنی جو کار کی تیز روشنی کی وجہ سے غائب ہو گئی تھی، پھر اپنی بہاریں دکھا رہی تھی۔ بھیگی رات کی خنکی کا احساس بھی پھر لوٹ آیا تھا جو کار کی کھڑکھڑاہٹ میں دب گیا تھا۔

ڈھلان سے اترتے ہوئے اس نے جب دور بہت دور چودھویں کے چاند کو اپنے پورے شباب پر چمکتے دیکھا تو اسے کچھ دیر کے لیے ایسا لگا کہ وہ کوئی حسین سپنا دیکھ رہا ہے۔

"میں بھی کتنا خوش نصیب ہوں۔" رحیمو نے سوچا۔ "کیا چاندنی ہے اور کیا

گلاب ہے۔ سرور کتنے دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہے جیسے کوئی جادوگر منتر پڑھ رہا ہو۔"

"آہستہ بیٹے آہستہ۔" رحیمو نے پھر کہنا شروع کیا۔ "تم تو نواب صاحب کو جانتے ہی ہونا۔ وہ کئی مرتبہ اپنے ٹانگے میں بیٹھ چکے ہیں۔ یہ ان کا ملازم تاجو ہے، جو اپنے ٹانگے میں بے ہوش پڑا ہوا ہے۔

رحیمو نے ہاتھ بڑھا کر تاجو کو سنبھالا جو ٹانگے میں ایک طرف جھک گیا تھا۔

"او بھائی تاجو! ہوش میں آؤ۔ دیکھو چاند کتنا پیارا پیارا نکلا ہے۔ کیوں اتنی پی لی کہ اپنے تن بدن کا تمہیں ہوش نہیں رہا۔ اس کھائی میں تم رات بھر پڑے رہتے تو تمہارا کیا حال ہوتا؟ وہ تو تمہاری قسمت اچھی تھی جو میں آج ادھر نکل گیا۔ تم وہاں بے ہوش پڑے ہوئے تھے، مجھے خیال آیا کہ نواب صاحب تمہارے لیے پریشان ہوں گے۔ چلو اسے ٹانگے میں ڈال کے پہنچا دیتے ہیں۔"

"ٹھیر جا بیٹے ٹھیر جا۔" رحیمو نے لگام کو ذرا کھینچ لیا۔ گھوڑا دوڑتے دوڑتے رک گیا۔ "موسم بہت اچھا ہے آج۔"

اور اس نے لگام کو ایک طرف رکھ کر جیب سے بوتل نکالی اور پھر ڈھکنے کے کھلتے ہی بوتل اس کے منہ سے جا لگی۔

گٹ گٹ ــــ دو بڑے سے گھونٹ اس کے حلق سے نیچے اُتر گئے۔

"یہ ..... یہ تیرا بانکپن۔" بوتل کو جیب میں رکھنے سے پہلے اس نے ایک اور بڑا سا گھونٹ بھرا ــــ "یہ تیرا بھولا پن ــــ"

بوتل پھر اس کی جیب میں اور لگام اس کے ہاتھ میں تھی۔ گھوڑا پھر اپنی پہلی چال میں دوڑ رہا تھا۔ سنسان سڑک پھر اس کے موڈ کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ گانے کی آواز اس کے گلے سے بڑی بے فکری کے ساتھ نکل رہی تھی۔

"ــــ توبہ شکن۔ توبہ شکن ــــ"

"۔۔۔۔ یہ تیرا بھولا پن۔ یہ ترا بانکپن ۔۔۔۔"

سناٹے میں اسے اپنا گانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ گھوڑے کی چال میں کچھ زیادہ ہی چستی آچلی تھی۔ سماں اتنا پیارا ہو چلا تھا کہ اسے ایسا لگا کہ وہ اس حالت میں اس سے زیادہ اچھا تصور جنت کا نہیں کر سکتا تھا۔ سُرخ رنگ کی شراب جسے وہ گلاب کہتا ہے اس کو ہوا میں بغیر پروں کے اُڑا رہی تھی اور وہ اوپر بادلوں میں سماتا جا رہا تھا۔

پھر ایک مرتبہ اس نے اپنے "بیٹے" کو رُک جانے کے لیے کہا اور پھر اس نے وہی عمل دُہرایا۔ دو بڑے گھونٹ بھرے۔ بوتل جیب میں رکھ کر اس نے بیڑی سلگالی۔ ہلکی روشنی میں اس نے دیکھا کہ تاجو اپنی مدہوشی میں پڑا ہوا تھا۔

"آج یہ تاجو کو کیا ہو گیا ۔۔۔؟" اس نے بیڑی پیتے پیتے سوچا۔ "کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے۔ تاجو تو کبھی شراب نہیں پیتا تھا۔ پھر آج اس نے اتنی کیوں پی لی ۔۔۔؟ پیار کیا تو ڈرنا کیا ۔۔۔۔"

ہوا کا ایک تیز جھونکا اس کے موڈ سے جا ٹکرایا اور پھر وہ اونچی آواز میں گانے لگا:

"الیسی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو ۔۔۔ عاشقِ دلگیر کو

کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو ۔۔۔ سیدھا تو کر لو تیر کو"

ابھی اس کا گانا ختم نہیں ہوا تھا کہ نواب صاحب کی کوٹھی دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا کچھ ہی دیر میں وہ کوٹھی کے صدر دروازے پر آوازیں لگا رہا تھا۔

پہلے کسی نے صدر دروازہ کھول کر اس سے بات کی۔ پھر کچھ دیر بعد اسے نواب صاحب نظر آئے۔ انہیں یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی کہ رحیمو کے تانگے میں اس وقت تاجو شراب کے نشے میں بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ رحیمو اور اپنے دوسرے ملازم کی مدد سے وہ تاجو کو اتار کر کوٹھی کے اندر لے گئے۔

دوبارہ جب وہ باہر آئے تو انہوں نے رحیمو کو کچھ روپے دیے۔ رحیمو انہیں سلام کر کے

آگے بڑھ گیا، اور وہ کوٹھی کے اندر جانے کے بجائے سڑک کے کنارے ہی ٹہلنے لگے۔

نواب صاحب کو ہلکے ہلکے سرور میں ٹہلنا کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ پوری کوٹھی پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ان کی بیگم جو کچھ دیر پہلے جاگ گئی تھیں، گود میں لیے بچّے کو کمرے میں سلانے کے لیے جا چکی تھیں۔

"پر یہ آج تاجو کو کیا ہو گیا ہے۔" وہ سگریٹ پیتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ "وہ کبھی شراب نہیں پیتا تھا۔ پھر آج اس نے اتنی شراب کیوں پی ہے؟"

اور پھر انہیں یکایک یاد آیا ــــ یہ مہینہ بھر سے کہاں تھا؟ اس کو تو میں نے ہر طرف تلاش کروایا تھا مگر یہ کسی کو دکھائی ہی نہیں دیا تھا، پھر یہ شہر میں کہاں سے آ گیا؟

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اگر تاجو اس حالت میں کوٹھی میں نہ لایا گیا ہوتا، تو نواب صاحب بھی صدر دروازہ بند کر کے کب کے اپنے کمرے میں چلے گئے ہوتے۔

تاجو کو اس حالت میں دیکھتے ہی ان کے غصّہ کا پارہ ایک دم چڑھ گیا تھا ــــ مگر انہوں نے اپنے غصّہ کو ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔

اب جب کہ وہ اپنے کمرے میں آرام کرسی پر آ کر بیٹھ چکے تھے اور انہوں نے ایک پورا پگ تیار کر کے گلے سے نیچے اتار لیا تھا تو انہیں تاجو کا خیال پریشان کرنے لگا۔ پچھلے ایک ماہ سے ان کی دلی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ جیسے ہی کسی نے تاجو کا نام ان کے سامنے لیا کہ وہ آگ بگولہ ہو گئے۔

انہوں نے سگریٹ سلگا کر آرام کرسی پر ٹیک لگائی۔ خیالات کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ دفعتاً انہیں اپنا خاندان یاد آنے لگا۔

نواب مختارالدین کو سب سے پہلے اپنے والد افتخارالدین یاد آئے، جو شہر کے مشہور و معروف نواب خاندان کے ایک اہم ستون تھے۔ وہ نواب نجم الدین کے بڑے چچیرے بھائی تھے۔ ایک زمانہ تھا، وہ سب ایک ہی کوٹھی میں رہتے تھے، مگر جب نواب نجم الدین نے اپنے خاندان سے باہر شادی کر لی تو نواب مختارالدین کے والد نواب افتخارالدین اور نواب نجم الدین میں ناچاقی پیدا

ہوگئی۔ یہ ناچاقی آگے بڑھ کر کوئی خاندانی منافرت کو جنم نہ دے دے اس اندیشے سے نواب نجم الدین نے کوٹھی ہی چھوڑ دی اور الگ مکان لے کر رہنے لگے۔ کوٹھی چھوڑنے کے بعد انہوں نے اپنی جاگیر بھی الگ کرلی۔ کچھ سال بعد دونوں بھائیوں میں صلح ہوگئی۔ لیکن نواب نجم الدین نے دوبارہ لوٹ کر کوٹھی میں آنا پسند نہیں کیا۔

نواب مختارالدین کے والد نواب افتخارالدین کو اپنے اعلیٰ خاندان پر بہت زیادہ ناز تھا۔ وہ اپنے آپ کو نواب خاندان کا صحیح وارث سمجھتے تھے۔ صورت شکل سے بھی اور عادات واطوار سے بھی وہ صحیح معنوں میں نواب نظر آتے تھے۔

انہیں جہاں اپنے نواب ہونے پر ناز تھا وہیں بہت زیادہ خوب صورت ہونے کا احساس بھی تھا، جس کا اظہار وہ وقت بے وقت کیا کرتے تھے۔ اور واقعی وہ تھے بھی بہت خوب صورت۔ پُروجیہہ اور قدآور۔ اتنی چوڑی چھاتی کہ کوئی دیکھتا رہے۔ صحت مند ایسے کہ پہلوان شرما جائیں۔ نازک مزاج اتنے کہ لکھنوی نواب یاد آجائیں۔

انہی کے چچیرے بھائی تھے نواب نجم الدین۔ ویسے ہی خوب صورت، پُروجیہہ، اور صحت مند۔ مگر دونوں کے عادات واطوار اور مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

نواب نجم الدین کی پہلی شادی تو نواب خاندان کی ایک لڑکی سلطانہ بیگم سے ہوئی تھی مگر کچھ دنوں بعد ہی انہوں نے اپنی مرضی سے زُبیدہ بانو سے شادی رچالی۔ جس سے نواب کوٹھی میں ہی نہیں، بلکہ پورے شہر میں ایک تہلکہ مچ گیا تھا، اور نواب افتخارالدین کو اپنے خاندان کی عزت مٹی میں ملتی نظر آنے لگی تھی، کیوں کہ زبیدہ نواب خاندان کے ایک ملازم کریم بیگ کی لڑکی تھی۔

نواب افتخارالدین کو یہ بات ناپسند تھی کہ ان کے ملازم کی بیٹی نواب خاندان کی بہو کہلائے۔ انہوں نے بہت چاہا کہ نواب خاندان میں باہر کا خون شامل نہ ہونے پائے، مگر نہ چلی۔ نواب نجم الدین پر زبیدہ بانو نے کیا جادو کردیا تھا کہ انہوں نے کسی کی ایک نہ مانی اور

زبیدہ بانو سے شادی کر کے ہی دم لیا۔

یہی بات —— نواب افتخار الدین کو اس وقت بہت یاد آئی تھی جب ان کے چہیتے بیٹے نواب مختار الدین کی شادی کی بات قدسیہ بانو سے کرنے کی تجویز ان کی بیگم نے رکھی تھی تو وہ آگ بگولہ ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنی بیگم سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ میری زندگی میں یہ شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔ آئندہ بھول کر بھی ایسی بات مجھ سے نہ کی جائے، ورنہ تمہیں طلاق دے دی جائے گی۔

مگر جب قدسیہ بانو نے زہر کھا لیا تو انہوں نے نواب مختار الدین کی شادی نواب نجم الدین کی دوسری بیٹی رقیہ بیگم سے کرنے کی خوشی خوشی اجازت دے دی، کیوں کہ وہ نواب خاندان کی بڑی بہو سلطانہ بیگم کے بطن سے تھیں۔

نواب مختار الدین کو صحیح معنوں میں دلی محبت قدسیہ بانو سے تھی۔ مگر جب بڑے نواب صاحب نے اس سے شادی کی اجازت نہیں دی اور قدسیہ بانو نے زہر کھا کر خودکشی کر لی، تو انہوں نے بادلِ ناخواستہ رقیہ بیگم سے شادی کر لی۔

رقیہ بیگم سے ان کی شادی اتنی دھوم دھام کے ساتھ ہوئی کہ نواب مختار الدین قدسیہ بیگم کو بھلا بیٹھے۔ جب رقیہ بیگم دلہن بن کر اس کوٹھی میں آئی تھیں تو اس کوٹھی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ رات پر دن کا گمان ہوتا تھا۔

نواب مختار الدین کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ دلہن کی ڈولی کے ساتھ سجے سجائے گھوڑے پر سوار نواب کوٹھی پر پہنچے تھے تو نواب صاحب نے کتنی جھولیاں بھر کر روپے لٹائے تھے یہ یاد کرتے ہی چھن چھن کی آواز ان کے کانوں میں گونجنے لگی۔ اور انہیں چاروں طرف روپے برستے نظر آنے لگے۔ اور روپیوں کی بارش میں انہیں رقیہ بیگم کا خوب صورت چہرہ نظر آنے لگا۔

یہ چہرہ ان کے لیے کچھ اجنبی نہیں تھا۔ وہ اس چہرے کو شادی سے پہلے کئی مرتبہ

اسی کوٹھی اور نواب نجم الدین کے مکان میں کئی مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ جب انہوں نے حجلۂ عروسی میں پہلی مرتبہ ان کا گھونگھٹ اٹھایا تھا تو وہ انہیں دیکھتے رہ گئے تھے۔ اس دن سے وہ انہیں اتنی پیاری اور بھلی لگیں کہ انہیں دیکھے بغیر نواب صاحب کو چین ہی نہیں آتا۔ وہ ایک منٹ کے لیے بھی انہیں اپنے سے جدا رکھنا نہیں چاہتے تھے۔

شروع شروع میں انہوں نے اپنی عادتوں اور شوقوں کو اپنی بیگم رقیہ سے پوشیدہ رکھا۔ لیکن وہ دھیرے دھیرے ان کے ہر راز سے واقف ہو گئیں۔

جلد ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ پیتے بھی ہیں، تاش بھی کھیلتے ہیں اور طوائفوں کے کوٹھوں پر بھی جاتے ہیں ــــ اور ــــ اور ــــ وہ بہت عاشق مزاج ہیں۔

شادی کے بعد کچھ دنوں تک انہوں نے احتیاط سے کام لیا۔ لیکن کب تک احتیاط برتتے آخر پردہ اٹھ ہی گیا۔ جب پردہ ہی اُٹھ گیا تو کِس بات کی شرم، کیسا ادب و لحاظ؟

بڑے نواب صاحب کے مرنے کے بعد جب وہ پورے نواب بن گئے تو وہ کوٹھی میں بیٹھ کر رقیہ بیگم کے سامنے پینے لگے اور انہوں نے یہ دیکھا کہ رقیہ بیگم اس پر کچھ برہم اور ناراض نہیں ہوئیں تو وہ موڈ میں آنے کے بعد اپنی محبتوں کے قصّے مزے لے لے کر سنانے لگے۔

رقیہ بیگم کو کبھی ان قصّوں سے جلن پیدا نہیں ہوئی، کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ نواب مختار الدین انہیں کتنا چاہتے ہیں۔ ایک بات کا احساس رقیہ بیگم کو ہو گیا تھا کہ نشہ کی حالت میں نواب صاحب یا تو ان سے محبت جتلانے لگتے یا پھر اپنی بے شمار محبتوں کے قصّے مزے لے لے کر سنانے لگتے۔

رقیہ بیگم کو کبھی تو یہ محسوس ہوتا کہ ان کی بہت سی سوکنیں ہیں اور کبھی یہ خیال پیدا ہوتا کہ نواب صاحب کو ان سے زیادہ محبت کسی اور سے نہیں ہے، اور کبھی تو ایسا لگتا کہ بس یہ ایک نشہ ہے اور کچھ نہیں ــــ اور یہی سوچتے سوچتے اور خیال کرتے کرتے زندگی گزرنے لگی ــــ اولادیں پیدا ہونے لگیں اور جب وہ کوٹھی کی "بیگم صاحبہ" بن گئیں تو زندگی ایک ڈھرے پر لگ

گئی۔ نواب صاحب روز پیتے اور وہ دیکھتی رہتیں۔ اور ان کی پیار بھری باتیں سنتی رہتیں۔ نہیں سُنا جاتا تو اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتیں اور تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر سو جاتیں۔ لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ نواب صاحب کی یہی عادتیں ایک دن ان کے دل و دماغ میں ایک طوفان مچا دیں گی اور ان سے ان کا آرام و سکون چھین لیں گی۔

یوں تو نواب صاحب اس رات سے ہی بے چین تھے جس رات ان کے ملازم تاج محمد نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ وہ ان کی بیوی رقیہ سے محبت کرتا ہے۔

تاج محمد نے اس بات کا اقرار نواب مختار الدین کے اصرار پر ہی کیا تھا۔ اس رات نواب صاحب پر تاج محمد کی داستانِ محبت سننے کی ضد سوار ہو گئی تھی۔ مجبوراً تاج محمد کو اپنی محبت کی داستان سنانا پڑی تھی۔

یہ ایسی ہی خوش گوار اور سہانی رات کی بات ہے جب چودہویں کا چاند اپنی چاندنی بکھیر رہا تھا۔ نواب صاحب معمول کے مطابق شروع شام ہی سے پینے میں مشغول تھے۔ انہوں نے ابھی دو تین ہی پیگ لیے تھے کہ ان کو اپنی بے شمار محبتیں یاد آنے لگیں۔

پہلے پیگ سے انہیں اپنی پہلی محبوبہ یاد آ رہی تھی جس کا ذکر وہ اکثر سرور کے چڑھتے ہی شروع کر دیتے تھے ــــ اس دن بھی جب ان پر سرور چڑھنا شروع ہوا تو انہیں اپنی پہلی محبت یاد آنے لگی ــــ ایکایک انہوں نے تاج محمد کی طرف اٹھتی ہوئی نظر ڈالی جو اُن کے پھیلے ہوئے پیروں کو داب رہا تھا۔ اس وقت وہ آرام کرسی پر دراز تھے۔ انہوں نے رومانٹک انداز سے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے تاجو سے پوچھا:

"تم نے کبھی محبت کی ہے؟"

اب بھلا تاجو ــ جو اُن کا ملازم تھا، اپنے مالک کو کیا جواب دیتا ــ بے چارہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ شراب کے نشے میں نواب صاحب پر تاجو کی محبت جاننے کی دُھن سوار ہو گئی اور انہوں نے اپنا سوال دُہرایا:

"بتلاؤ تاجو ـــ تم نے محبت کی ہے ؟"

تاجو نے بہت انکار کیا مگر نواب صاحب نے یقین نہیں کیا۔ جیسے جیسے وہ انکار کرتا رہا ویسے ویسے نواب صاحب کی ضد میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ تھک ہار کر اس نے یہ کہہ دیا کہ آپ کہتے ہیں تو میں نے بھی پیار کیا ہے ــــ اس پر بھی نواب صاحب بس کرتے تو کوئی بات ہی نہیں ہوتی ـ لیکن وہ یہی کہتے رہے کہ اب وقت ضائع نہ کرو ـ جلدی سے ہمیں اپنی پیار بھری داستان سنادو ـ آج تم سے ہم پوچھ کر ہی دم لیں گے ـ

"آپ کہتے ہیں تو میں نے بھی پیار کیا ہے ـ" تاج محمد نے رُکتے رُکتے اقرار کیا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ نواب صاحب جتنے نازک مزاج ہیں اتنے ہی تنک مزاج بھی ہیں مسلسل انکار ان کا موڈ خراب نہ کردے ـ اس اندیشے نے اس کو اقرار کرنے پر مجبور کردیا ـ

اس نے پہلے بتایا کہ اسے ایک لڑکی کو دیکھ کر دل پر قابو نہیں رہا۔ وہ لڑکی روزانہ اس کی گلی سے ہو کر اسکول جایا کرتی تھی ـ وہ بڑے گھرانے کی لڑکی تھی لیکن تھی بہت خوب صورت ! میں تو اس کو دیکھتا تو خود کو بھول جاتا ـ بس سرکار !

اس کے بعد بھی نواب صاحب ضد کرتے رہے کہ اس نے کس سے محبت کی ـــ مجبور ہو کر تاجو نے کہا کہ :

"پھر مجھے اس لڑکی سے محبت ہو گئی ـ جس نے محبت میں اپنی جان دے دی ـ وہ میرے پڑوس میں رہتی تھی ـ اس کی ہنسی بہت اچھی تھی سرکار ـ جب وہ ہنستی تھی تو جیسے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں ـ بڑی دل بستگی تھی اس کی ہنسی میں، جیسے نقرئی سکّوں کو کوئی اچھالے پھر تو ان کی آوازوں کے مانند ـ"

جب تاج محمد اپنی داستانِ محبت سُنا رہا تھا تو رقیہ بیگم نہ جانے کب سے ان کے نزدیک خاموش کھڑی ہوئی سُن رہی تھیں ـ اور ان کے پوچھنے پر ہی تاج محمد نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ اسے اس اسکول والی لڑکی سے محبت ہے جسے اس نے ایک دن بغیر برقع کے دیکھ لیا تھا،

اور جب اسے نام بتلانے پر مجبور کیا گیا تو نہ جانے کیسے ان کے منہ سے نکل گیا:

"ر۔ قی۔ یا ــــ کوئی اور نہیں۔"

اتنا سنتے ہی رقیہ بیگم کرسی پر سے ایکدم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جیسے انہیں بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہے۔ اور نواب صاحب کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں اپنے حواس پر قابو پاتے تاج محمد کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

اس دن کے بعد نواب صاحب نے تاج محمد کو بہت تلاش کروایا لیکن اس کا کچھ پتہ نہ چلا جس سے نواب صاحب کو جہاں ایک طرف یہ یقین ہو گیا کہ سچ مچ اسے رقیہ بیگم سے محبت ہے تو دوسری طرف انہیں یہ بھی پچھتاوا رہا کہ انہوں نے اس رات ہی تاج محمد کو کیوں نہ گولی مار دی، تاکہ قصّہ ہی پاک ہو گیا ہوتا ــــ مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ تاج محمد کا کوئی پتہ نہیں تھا۔

انہوں نے اس بات کو بھلانے کی بہت کوشش کی، لیکن انہیں رہ رہ کر تاج محمد کی بات یاد آتی رہی اور وہ اپنی بے چینی میں اضافہ ہی محسوس کرتے رہے۔

ابھی وہ تاج محمد کی بات اچھی طرح بھول نہیں پائے تھے کہ رحیم بخش ٹانگے والا تاج محمد کو بے ہوشی کی حالت میں لے کر کوٹھی پہنچا۔ پہلے تو نواب صاحب کو یقین نہیں آیا کہ جس شخص کی تلاش میں وہ ایک ماہ سے پریشان تھے وہ ان کی کوٹھی میں شراب کے نشے میں مدہوش پڑا ہوا ہے۔

بڑھتی بے چینی کو انہوں نے شراب سے بھرے گلاس کو منہ سے لگا کر دور کرنا چاہا، مگر شراب سے ان کی بے چینی دور ہو سکتی تو وہ کب کی دور ہو گئی ہوتی! کیوں کہ وہ دن رات تو شراب پیتے رہتے تھے ــــ پھر بے چینی کیسے دور ہو گی؟ ــــ انہوں نے سگریٹ پیتے پیتے سوچا۔

ابھی وہ اس بات پر سوچ ہی رہے تھے کہ رقیہ بیگم کی آواز پر چونکے جو کمرے میں داخل ہو کر ان سے پوچھ رہی تھیں:

"کیا آج سونے کا ارادہ نہیں ہے؟"
نواب صاحب نے مختصر سا جواب دیا:
"نیند نہیں آ رہی ہے۔"
"آپ پیتے وقت کچھ زیادہ ہی سوچتے ہیں۔" رقیہ بیگم قریب آ کر دری پر بیٹھ گئیں۔ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھیں۔
"حقیقت کا پتہ تو چلنا ہی چاہیے۔" نواب صاحب نے سگریٹ سلگائی۔ "کہ وہ کس سے محبت کرتا ہے؟"
"آپ اس بات کو بھولنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"
"کیسے بھول جاؤں۔ رقو۔ اس بات کو۔" نواب صاحب نے پھر گلاس میں شراب انڈیلی۔ "جو میرے رگ وپے میں زہر کی طرح سرایت کر چکی ہے۔ جو ایک تیر کی طرح میرے دل میں پیوست ہو چکی ہے۔"
"پھر آپ چاہتے کیا ہیں؟" رقیہ بیگم کی آواز میں بیزاری تھی۔
"میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے بتلا دے کہ اسے کس سے محبت ہے؟"
نواب صاحب کی زبان پر وہی ضد تھی۔
"تاجو ہوش میں آئے تو اس سے پوچھ لیجیے۔"
"اس سے تو پوچھوں گا ہی، لیکن پہلے تم مجھے بتلا دو کہ اسے کس سے محبت ہے؟"
"اس نے آپ کو بتایا تھا نا کہ۔" رقیہ بیگم نے تاجو کے اس رات کے کہے ہوئے الفاظ دہرائے "مجھے اس لڑکی سے محبت ہو گئی جس نے محبت میں اپنی جان دے دی۔ جو میرے پڑوس میں رہتی تھی، اس کا نام میمونہ تھا، جس کی ہنسی بہت اچھی تھی۔ جب وہ ہنستی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔"
"نہیں۔" نواب صاحب نے ایش ٹرے میں سگریٹ بجھائی۔ "وہ تو ایک کہانی

تھی جو اس نے میرے کہنے پر سنائی تھی۔ اسے تو اسکول والی اس لڑکی سے محبت تھی جس کو دیکھ کر وہ اپنے ہوش و حواس کھو دیتا تھا۔ جو اس کی گلی سے ہو کر اسکول جایا کرتی تھی۔ وہ برقع میں روزانہ اسکول جایا کرتی تھی۔ لیکن ایک دن تاجو نے اسے بغیر برقع کے دیکھ لیا تھا۔"

رقیہ بیگم ہنس دیں:

"اور آپ نے اس پر یقین کر لیا۔"

"ہاں! یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں۔" آرام کرسی پر نواب صاحب نے ٹیک لگائی۔ "مجھے تو اس کی بات سچ لگتی ہے۔"

"اور میمونہ والی بات پر یقین نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟" رقیہ بیگم نے پوچھنے کی خاطر پوچھا۔

"ہے وجہ۔" وہ کرسی پر ٹھیک سے بیٹھ گئے۔ "اس بات پر یقین نہ کرنے کی وجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ تاجو نے تمہارے یہ پوچھنے پر کہ کیا تم کو میمونہ یاد نہیں آتی؟ اس نے صاف طور پر یہ کہا تھا کہ نہیں وہ تو ایک کہانی تھی۔"

"اور ـــ"

"اور ـــ" نواب صاحب نے رکتے رکتے اپنی بات پوری کی: "تاجو نے کہا تھا نا کہ وہ اسکول والی لڑکی کسی بڑے گھرانے کی تھی۔"

"تو ـــ" آخر نواب صاحب کے دل میں گھر کی ہوئی بات زبان پر آ ہی گئی ـــ

"تم نے ہی اُس کو اپنی قسم دی تھی نا اس لڑکی کا نام بتلانے کے لیے۔ جس پر تاجو نے کہا تھا: "ر ـــ قی ـــ یا ـــ کوئی اور نہیں، وہ آپ ہی ہیں ..." تمہارے سامنے اس نے اپنی محبت کا اقرار کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے!" رقیہ بیگم نے اپنے دل میں اٹھتی ہوئی ہوک کو دباتے ہوئے نواب صاحب سے پوچھا۔ "فرض کرو اسے مجھ سے محبت ہے تو آپ کیا کریں گے؟"

"مَیں... مَیں۔" نواب صاحب کے منہ سے غصّہ میں الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

"میں اسے گولی مار دوں گا۔"

"بہت خوب۔" رقیہ بیگم ایک دم سنجیدہ ہوگئیں۔ "آپ محبت کریں تو کچھ نہیں اور کوئی دوسرا محبت کرے تو آپ اس کو گولی مار دیں گے۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ آپ نے کتنی حسیناؤں سے محبت کی ہے۔ خود آپ نے میرے سامنے کئی بار کہا ہے کہ آپ نے بے شمار پیار کیے ہیں۔"

"میری بات اور ہے۔" نواب صاحب نے پھر کرسی کا سہارا لیا۔

"آپ کی بات کیوں اور ہے؟" رقیہ بیگم نے بھی جیسے آج انہیں قائل کرنے کی قسم کھالی تھی۔ "اِس لیے کہ آپ نواب ہیں۔ آپ کے پاس کوٹھی ہے۔ نوکر چاکر ہیں۔ آپ کو محبت اور پیار کرنے کا حق ہے اور ان کو نہیں — جو آپ کے ملازم ہیں۔ کیوں کہ وہ غریب ہیں، مزدور ہیں۔"

نواب صاحب اپنی بیگم کے تپتے ہوئے چہرے کی تاب نہ لاسکے۔ جیسے دھاگا جلتی ہوئی تیلی کے سامنے کردینے پر جل اٹھتا ہے، اسی طرح ان کی نظریں جلتی ہوئی انہیں محسوس ہوئیں، انہوں نے نظریں چُرا لینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی، کیوں کہ ان کی بیگم صاحبہ اپنے پورے جاہ و جلال میں تھیں۔

اِس سے پہلے انہوں نے ان کا ایسا روپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہیں حیرت تھی کہ وہ ایسا روپ بھی دھار سکتی ہیں۔ سُریلی آواز میں اتنی گہری کاٹ بھی ہوسکتی ہے یہ چیز ان کے گمان سے باہر تھی۔ پھول کی پتّی جیسے ان کے پتھر دل کو کاٹ رہی تھی، اور برمے کی طرح ان کے کلیجے کو چھید رہی تھی۔

نواب صاحب سے یہ باتیں سنی نہیں گئیں، اور انہوں نے خاموشی اختیار کرنے ہی میں بہتری سمجھی — پر وہ اس آگ کو کیا کرتے؟ جو ان کے سینے میں بھڑک رہی تھی۔ شراب سے

بھرے ہوئے گلاس کو انہوں نے جلدی سے اٹھایا اور ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیا جیسے بیگم کی کڑوی کسیلی باتیں وہ گوش گزار کر رہے تھے۔

"آپ شراب پئیں تو کچھ نہیں۔" رقیہ بیگم آج سب کچھ کہنے پر تلی ہوئی تھیں۔ "اور وہ غریب پئیں تو گناہ ہو جاتا ہے۔"

"تم میرے دکھوں کو کیا جانو؟" نواب صاحب نے اظہارِ دکھ کیا۔ "ہم نوابوں کی اولاد ہیں۔ ہماری نوابی جاتی رہی، یہ کیا کم دکھ ہے؟"

"تمہارے دکھ دکھ ہیں اور ان کے دکھ کچھ نہیں۔" رقیہ بیگم غمگین ہو گئیں۔ "آپ نواب ہیں۔ آپ اپنے دکھ تو سمجھتے ہیں، لیکن ان غریبوں کے دکھوں کو کون جانے گا — جنہیں دو وقت کی روٹی بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔"

"مگر ایک ملازم کو اپنے مالک کی بیوی سے محبت کرنے کا کیا حق ہے؟" نواب صاحب بھی ہار ماننا نہیں چاہتے تھے۔

انہوں نے اپنے دل میں چبھتی ہوئی پھانس کو نکال پھینکنا چاہا:

"ملازم۔ ملازم ہوتا ہے۔ اور مالک۔ مالک۔"

"جی ہاں!" رقیہ بیگم نے بھی وہی انداز اپنایا جس میں بات کہی گئی تھی۔ "مالک کو حق ہے وہ اپنے ملازم کی بیٹی سے عشق کر سکتا ہے۔ ملازم کو یہ حق نہیں کہ وہ مالک کی ہونے والی بیوی سے محبت کرے۔ آپ کو بھی تو اپنے ملازم کی خوبصورت بیٹی سے محبت ہو گئی تھی۔ جسے آپ اپنی پہلی محبت کہتے ہیں۔"

"لیکن میں نے کسی کی بیوی سے محبت تو نہیں کی تھی۔" اپنی دلیل سے نواب صاحب نے اپنی بیگم کو چپ کرانا چاہا۔

"سچ ہے۔ آپ نے کسی کی بیوی سے محبت نہیں کی۔" رقیہ بیگم بھی چپ ہونا نہیں چاہتی تھیں — "مگر آپ نے کسی کی بہن سے تو محبت کی تھی، جس نے اپنی بہن کو آپ کی خوابگاہ

میں پاکر چاقو مار دیا تھا۔ اور خودکشی کرلی تھی۔"

"میں تو صرف اتنا جاننا چاہتا تھا کہ —" نواب صاحب نے اپنے دل کی بات کہی۔ "کہ تاجو کو کس سے محبت ہے؟ میمونہ سے — یا —"

"— یا —" رقیہ بیگم نے بات پوری کی — "مجھ سے — فرض کرو اسے مجھ سے محبت ہے تو آپ کیا کریں گے؟"

"میں اسے گولی مار دوں گا۔ . . ." نواب صاحب کے دل کی بات غصہ میں زبان پر آگئی۔

"اور میں کہوں کہ —" رقیہ بیگم سے بھی رہا نہیں گیا۔ "کہ مجھے بھی اس سے محبت ہے تو . . . ."

ابھی ان کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ نواب صاحب ایک دم طیش میں بھر گئے غصہ میں میز سے ایش ٹرے اٹھاتے ہوتے وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے:

"میں تم کو گھر سے نکال دوں گا۔"

"بس گھر سے نکال دیں گے —؟" رقیہ بیگم کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی — "کیوں — گولی نہیں ماریں گے . . . . اس لیے کہ میں آپ کے دو بچوں کی ماں ہوں۔"

"حرام زادی — بس کر —" لاچارگی میں وہ کرسی پر بیٹھ گئے — "کیوں ایسی باتیں کر رہی ہے جسے سن کر میرا خون کھول رہا ہے۔"

"ہاں ایسی باتیں سننے سے آپ کا خون کھولتا ہے" — رقیہ بیگم نے چبھتے ہوئے لفظوں میں کہا۔ "کبھی آپ نے سوچا ہے اس کا خون کتنا کھولا ہوگا جس کی بڑی بہن نے آپ کی خاطر زہر کھالیا تھا۔"

"خدا کے لیے بس کرو رقیہ —" نواب صاحب تقریباً روہانسے ہوگئے — "ورنہ میرا سینہ پھٹ جائے گا۔"

"آپ کا سینہ پھٹ جائے گا۔؟" رقیہ بیگم کی بھی آواز بھرا گئی۔ "اور میرا سینہ پتھر کا ہے۔ جو نہیں پھٹے گا؟ یہ سُن کر بھی کہ میری بڑی بہن نے صرف میری خوشی کے لیے اپنی جان دے دی۔ میری مجبوری دیکھیے۔ مَیں کسی سے یہ بھی تو نہیں کہہ سکتی کہ میری پیاری بہن نے کیوں زہر کھا لیا تھا۔ اس بات کے لیے کس کو مَیں ذمّہ دار ٹھہراؤں ...؟ آپ کو ..... یا .... خود کو ....؟"

رقیہ بیگم نے سینہ سے اٹھنے والی چیخ کو روکنے کے لیے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ مگر چیخ میں بڑی شدت تھی۔ وہ روک نہ سکیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

کاٹو تو جیسے خون نہ ہو نواب صاحب میں۔ ان کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ یونہی ٹکٹکی باندھے رقیہ کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھتے رہے۔ ان کے گلے میں الفاظ اٹک سے گئے تھے۔

کمرے کی فضا پہلے ہی سہمی سہمی تھی۔ رقیہ بیگم سر جھکائے سسکیاں بھر رہی تھیں۔ کمرے کی فضا اتنی غم گین اور بوجھل ہو گئی تھی کہ اب اور زیادہ غم برداشت کیا جائے گا تو وہ گر کر ڈھیر ہو جائیں گے۔ یا پھر رقیہ بیگم کا سینہ سچ مچ پھٹ جائے گا۔

نواب صاحب نے اپنا گلا سوکھتا ہوا محسوس کیا۔ گلاس میں بچی ہوئی شراب کو انہوں نے جلدی سے گلے سے نیچے اتاری۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے آرام کرسی سے اٹھے اور لڑکھڑاتے ہوئے وہاں تک گئے جہاں رقیہ بیگم سر جھکائے رو رہی تھیں۔

"بس کرو رقو ...." ان کے گلے سے بہ مشکل الفاظ نکل رہے تھے "بس کرو۔ مجھے معاف کر دو۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اس کو بھول جاؤ۔ اسی میں ہماری بھلائی ہے۔ مَیں تاجو کو بھی کچھ نہ کہوں گا۔ مَیں اسے بھی معاف کر دوں گا۔ لیکن خدارا تم مجھے پہلے معاف کر دو، ورنہ مَیں اپنی جان دے دوں گا۔"

"مَیں نے آپ کو معاف کیا۔" روتی ہوئی رقیہ بیگم نے نواب صاحب کی گود میں

اپنا سر رکھ دیا۔

"آپ بھی مجھے معاف کردیں۔ میں نے آج آپ کا دل دکھایا ہے۔ اُف میرے خدا! یہ میں نے کیا کیا؟"

"میں نے تمہیں —" رقیہ بیگم کے بالوں کو سہلاتے ہوئے نواب صاحب نے کہا۔ "حرام زادی کہا — حرام زادہ — تو میں ہوں۔ جو یہ بھول گیا تھا کہ — محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے، جو ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی۔"

اور جیسے ہی رقیہ بیگم نے ان کی گود سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا نواب صاحب نے ان کے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لینا چاہا کہ وہ۔ پچھی دری پر لیٹ گئے اور اس سے پہلے کہ رقیہ بیگم ان کو سنبھالتیں، وہ سُدھ بُدھ کھو چکے تھے۔

••

ایک تھی بڑھیا

"ماں۔ ماں۔ میں میں۔" بکری چلّانے لگی۔

بوڑھی عورت بکری کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ بکری نے چلّانا بند کر دیا، اور اپنی گردن ٹوکری میں ڈال دی۔ ٹوکری کے اندر الگ الگ تھیلیوں میں چنے، کھیلیاں اور مونگ پھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بکری نے چنوں سے اپنا منہ بھرا اور ذرا دور ہٹ کر انہیں آرام سے چبانے لگی۔

"ہت تمہارے مردودوں کی۔ میں تو تنگ آگئی تم سے۔" بوڑھی عورت نے بچوں کو دھتکارا۔ "موئی کمبخت کبھی چین نہیں لینے دیتے۔ جب دیکھو چنے کی تھیلی میں ان کی مٹھی پڑی ہے۔"

"بائی! کیا ہوا؟" غلام رسول نے ٹوکری کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو نا بھیّا۔ خواہ مخواہ ستاتے ہیں۔" بائی نے جواب دیا۔ "کبھی چنے لے بھاگتے ہیں اور کبھی بکری کو مارتے ہیں۔"

"جانے دو، بچے ہی تو ہیں۔"

"ایسے بھی کس کام کے بچے جی! نہ ہوئی اولاد میری۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر چیر دوں۔"

"بچے اگر شرارت نہ کریں تو بچے کیسے کہلائیں۔" غلام رسول نے تھیلی سے کچھ چنے نکالے اور منہ میں گرا لیے۔

"پھر تم نے کیا سوچا؟"

"کس بارے میں ـــ؟"

"نورالدین" غلام رسول نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ قریب ہی بچے حلقہ بنائے کھیل رہے تھے۔ پاٹھ شالا کے پورے احاطے میں بچے پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ فاصلے پر بھولا ٹھیلے والا اپنے ننھے گاہکوں کو سودا دے رہا تھا۔ سامنے سڑک پر ٹانگے ڈولتے، اور موٹریں فراٹے بھرتے ہوئے دوڑ رہی تھیں۔ بنگلے کے قریب دو تین ماسٹر باتیں کر رہے تھے۔

"وہی جاگیردار نورالدین کی بیٹی۔ فریدہ کے متعلق۔"

"نا بابا ـــ نا ـــ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا نا ـــ یہ کام زندگی بھر نہ ہوگا۔" بوڑھی عورت نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"ارے میں کہتا ہوں۔" وہ ذرا آگے سرکا۔ "کیوں ضد کر رہی ہو؟ مزے سے بیٹھے بٹھائے تین چار سو روپے مل جائیں گے اور پھر ابراہیم سیٹھ کی نظروں میں بھی چڑھ جاؤ گی، تمہیں کیا خبر؟"

"آخر تم کیوں مجھے اس لفڑے میں گھسیٹ رہے ہو؟"

"وہ اس لیے کہ فریدہ تم سے بہت مانوس ہے۔ اکثر وہ تمہارے ہاں آتی جاتی رہتی ہے۔ اور یہ کام صرف تم ہی کر سکتی ہو۔"

"نا بھئی۔" بوڑھی عورت نے گردن ہلائی "چھی چھی چھی۔"

"سوچ لو۔" اس نے صلاح دی ـــ "میں تو تمہارے فائدے کی بات کر رہا ہوں تم نے اس سے پہلے عبدالصمد کی مدد کی تھی نا؟"

"تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ بات ہی اور تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "اس کی بہن کی سسرال والے اسے بہت تنگ کیا کرتے تھے۔ اسے اپنے ماں باپ سے بھی ملنے نہیں دیتے تھے۔ تھک ہار کر اس کی ماں میرے پاس آئی۔ غریب نے روتے روتے اپنی آنکھیں سجا لی تھیں۔ جب مجھ سے اس کا بلکنا نہ دیکھا گیا تو میں نے اس کی مدد کر دی۔ قسم لے کر اس سے پوچھ لو

بھوٹی کوڑی بھی نہ ہو اگر ——"

"اِسی طرح تھوڑی سی ہماری بھی مدد کردو۔ عمر بھر تمہارا احسان نہ بھولیں گے۔"

"جی نہیں۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔"

بچوں کو قریب آتے دیکھ کر اس نے اپنا پیچھا چھڑانا چاہا۔

"اچھی طرح سوچ لو۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر چنوں سے مٹھی بھری اور "جواب لینے پھر آؤں گا" کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

ٹن ٹن ٹن .... ن ن۔ ٹن —— پاٹھ شالا کی گھنٹی بج اٹھی۔ دو بج رہے تھے۔ کھانا کھانے کا وقفہ ختم ہو چکا تھا۔ بچے پاٹھ شالا میں داخل ہونے لگے۔ یہ شہر کا وہ حصہ تھا جو کبھی غیر آباد تھا۔ جہاں حدِ نظر تک کھیت چپ سادھے لیٹے رہتے تھے۔ اور ادھر ادھر پھیلے ہوئے تاڑی کے درخت ایسے دِکھائی دیتے تھے جیسے بندے ہاتھ باندھے نیت باندھے خدا کی عبادت کر رہے ہوں۔ وہاں دیکھتے ہی دیکھتے بلڈنگیں سر اٹھائے سینہ تانے آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ جہاں زہر کھانے کو نہ ملتا تھا، وہاں کچھ عرصہ میں ہر قسم کے سامان کی دکانیں ایسے کھلنے لگیں جیسے بہار میں پھول کھلنے لگتے ہیں۔

اِسی علاقے میں گنیش مندر والے چوراہے کے پچاس قدم بائیں طرف ایک چھوٹی سی پاٹھ شالا کے سامنے املی کے درخت کے نیچے وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ سوائے برسات کے جب دیکھو وہ اسی املی کے پیڑ سے پیٹھ لگائے بیٹھا کرتی ہے۔

اکثر اس کے بائیں ہاتھ میں جوار کا سوکھا لو دا دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے اس کے ارد گرد اس کی چہیتی بربری بکری چرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس کے بدن پر پیلے پیلے دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے گلے میں پٹا بڑا خوش نما لگتا ہے۔ پیروں کے گھنگھرو چلنے میں دلکش آوازیں دیتے ہیں۔

کوئی اگر بوڑھی عورت کو جو "بکری والی بائی" کے نام سے پکاری جاتی ہے سامنے سے نہ بھی دیکھے تو وہ دُور سے اِملی کے بڑے سے تنے کے باوجود ان چیزوں کو دیکھ کر اس کے موجود ہونے کا یقین کر سکتا ہے۔

اس کی عمر مشکل سے چالیس سال ہوگی۔ اس کے خد و خال دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حادثات زمانہ کے بے رحم ہاتھوں نے اس کو مسل کر رکھ دیا ہے۔ اس کی کالی کالی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ ستواں ناک جھرّیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ خوب صورتی میں شمار کی جانے والی دراز گردن اب ابھری ہوئی رگوں کا جال بن چکی تھی۔ سڈول بازو نچوڑے ہوئے کپڑے کے مانند دِکھائی دیتے تھے۔

پہلے سب اس کو "منتو منتو" کہتے تھے۔ اس کا پورا نام ممتاز بیگم ہے۔ اس کے والد جاگیر دار کبیر الدین کے لمبے چوڑے کھیت کی رکھوالی کرتے تھے اور باقی آٹھ ماہ جاگیر دار کی گوارڑی میں رہتے تھے۔

پاٹھ شالا کے سامنے اجاڑ میدان کے سرے پر گوارڑی واقع ہے۔ سامنے بالس کی ایک پھاٹک ہے۔ قطار میں کھولیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان کھولیوں کو آگے ایک کھولی ٹانکے کی طرح جوڑ دیتی ہے۔ اس میں ایک کنواں بھی ہے۔ کھولیوں کی چھت کہیں کہیں سے اس قدر نیچی ہے کہ اگر ایک قد آور آدمی تن کر کھڑا ہو جاتا تو اس کا سر چھت سے سرگوشی کرنے لگتا۔

سنتے ہیں کہ جلد ہی جاگیر دار نورالدین اسی گوارڑی کو گرا کر سنیما کھڑا کر دیں گے اور یہ آبادی کے چرچے سُن سُن کر گوارڑی کے باسی پریشان ہوئے جاتے ہیں۔

اسی گوارڑی میں "بکری والی بائی" نے آنکھ کھولی تھی۔ یہیں اس کی جوانی نے گنگنایا۔ یہیں اس کی ماں نے اس کی منگنی کے بعد اور باپ نے شادی کے بعد اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ جب اس کی اکلوتی بیٹی کی پہلی چیخ گونجی تھی تو وہ اسی گوارڑی میں تھی اور جب اس کی آخری ہچکی لگی وہ اسی گوارڑی میں تھی۔ صرف اس کو ایک مرتبہ اپنی کھولی بدلنی پڑی۔ جس کھولی میں وہ اٹھ کر آئی وہ

اس کے خاوند کی کھولی تھی۔

اس کا خاوند بھی پہلے کھیتوں میں رکھوالی کرتا تھا لیکن بعد میں راج کا کام سیکھ لیا تھا اور یہی راج کا کام اس کی موت کا باعث بنا۔ جاگیردار نورالدین کی پانچ منزلہ بنتی ہوئی بلڈنگ سے گر کر مر گیا۔ اس نے مرتے وقت اپنے رشتہ اور جائداد میں 'بکری والی بائی' کے لیے صرف یہی ایک بکری چھوڑی تھی۔

"بائی ۔۔۔ ! دس پیسے کے چنے دینا۔" ننھے گاہک نے پیسہ پیش کیا۔

پاٹھ شالا سے بچوں کی مل جل کر سبق پڑھنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ برف والے نے فرصت پاکر بیڑی سلگالی تھی۔ بھولا ٹیلے والا اور دوسری چیزیں فروخت کرنے والے آگے بڑھ چکے تھے۔

"اچھا۔" بائی نے ہاتھ بڑھا کر پیسہ لیا اور اسے اپنی آنکھوں سے لگا کر اس کی قیمت کا صحیح اندازہ کیا ۔۔۔ سکہ کالا پڑ چکا تھا مگر اس پر ابھرے ہوئے تمام لفظ اور تصویر ٹھیک حالت میں تھی۔ اس نے انگوٹھے سے دو تین مرتبہ رگڑے دیے۔ سکے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اس نے اسے ٹوکرے میں رکھ کر فٹ بھر لمبی ڈنڈی میں بندھی ہوئی ڈوری کو انگلیوں سے اوپر اٹھایا۔ ڈنڈی کے پیچھے ڈوریاں بل کھاتی سیدھی ہو گئیں۔ ڈوریوں میں بندھے ہوئے لوہے کے دونوں پلڑے جھول کر متوازی لٹک گئے۔

پلڑوں میں چنے اور ہاتھ کا بنا ہوا لوہے کا باٹ پڑتے ہی اس کے ہاتھ کا رعشہ اور زیادہ نمایاں ہو گیا۔ باٹ والا پلڑا جھکا ہوا دیکھ کر اس نے چنے سے مٹھی بھری اور دھیرے دھیرے دوسرے پلڑے میں چنے گرنے سے نیچے والا پلڑا اوپر اور اوپر والا پلڑا نیچے آنے لگا۔ پلڑوں کے ڈولنے کے باوجود جلد ہی اس نے اپنا تول برابر کر لیا۔ اور چنے لڑکے کی پھیلی ہوئی گود میں ڈال دیے۔

لڑکے نے پھیلی ہوئی گود سمیٹا اور ترچھی نظروں سے بائی کو دیکھا۔ وہ گھومے

ہوئے اپنے پیچھے رکھی ہوئی گدی کو ٹھیک کر رہی تھی، لڑکے نے ٹوکری کے پاس رکھا ہوا جوار کا سوکھا پودا اٹھایا اور آہستہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بکری کی پیٹھ پر زور سے جما دیا۔

بکری زور سے چلا اٹھی۔ بائی نے مڑ کر دیکھا۔ اسے لڑکا دور تک بھاگتا ہوا نظر آیا۔ جلد ہی بکری سے زیادہ بائی کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔

"حرام زادے! تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ کیا کھا گئی تھی میری بکری تیرا۔ آتو سہی ادھر تیری ٹانگیں نہ توڑ ڈالوں تو میرا نام نہیں۔"

عجیب سی گالیاں اور بڑے ہی بے تکے سے کوسنے سننے کے بعد بھی لوگ، بالخصوص بچے اس کی بکری کو چھیڑنے سے باز نہیں آتے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے متعلق کیے ہوئے مذاق کو برداشت کر لیتی لیکن اس کی بکری کو چھیڑا کہ وہ آپے سے باہر ہوئی۔

جب بھی بکری چیخ رہی ہوتی تو اس کا دھیان اس واقعہ کی طرف چلا جاتا جب اسی بکری کا بچہ اچھی طرح بھاگنے کے قابل نہ ہوا تھا کہ ایک دن شکاری کتے اسے اٹھا لے گئے۔ بکری کئی دن تک دردناک آوازیں لگاتی رہی۔ اس کی نہ رکنے والی چیخیں اس سے سُنی نہ جاتی تھیں۔

آوازیں لگاتے اس وقت جب بکری کی کمر کا گوشت تھرتھراتا تو بائی کو بھی اپنی پسلی پھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی۔ وہ اپنی دونوں پسلیاں داب کر جہاں رہتی وہاں بیٹھ جاتی۔ وہ ایک عجیب سی چبھن اپنے سینے میں محسوس کرتی۔ اس کا حلق سوکھ جاتا اور اس کو اپنی بیٹی یاد آجاتی جو اس کو ماں بھی نہ کہہ سکی تھی۔

اب پاٹھ شالا سے اٹھنے والی ملی جلی بچوں کی آوازیں بند ہو چکی تھیں۔ صرف کبھی کبھی کسی گرو جی کے چلانے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ برف والا بنگلے سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔

اجاڑ میدان کی نیند گہری ہو چکی تھی۔ یہ میدان بھی جاگیردار نورالدین کی ملکیت میں شامل ہے۔ انہیں کسی شبھ گھڑی کا انتظار ہے جب وہ اسے بائیں باغ والے بنگلے میں تبدیل

کر دیں گے۔ ابھی تو وہ پاٹھ شالا کے پیچھے والی کوٹھی میں رہتے ہیں۔

دن تیسری کروٹ لے رہا تھا۔ آمدورفت کی نبضیں ڈوب چلی تھیں۔ بکری سامنے میدان میں چر رہی تھی۔ بائی نے فرصت کا لمحہ پا کر املی کے پیڑ سے پیٹھ لگا دی۔ آنکھیں بند ہوتے ہی اس کو خیالات نے آ گھیرا۔ خیالات کا چکر چلتا رہا۔ اس گردش میں اس کے ذہن میں ایک نئی تصویر ابھری جو آج کے جاگیردار نورالدین کی نہیں تھی، بلکہ بیس سال پہلے کے "نورو" کی تھی۔

نورو کا خیال آتے ہی اس کے سامنے سنیما کے متحرک سین کی طرح وہ دن آ گیا جب گواڑی پر سکون تھی لیکن منتو کی کھولی میں خاموش طوفان برپا تھا۔ اس کے باپ پر سکتہ طاری تھا اس کی ماں کھاٹ کے پائے سے پیٹھ لگائے سر پر دایاں ہاتھ رکھے رو رہی تھی اور وہ کونے میں دیوار سے لگے اپنے سینے سے دونوں مٹھیاں بھینچے ہوئے کھڑی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ نظر اٹھا کر کسی کی بھی صورت دیکھ سکے۔ یا اپنے جسم کے ان حصوں پر ہاتھ پھیر سکے جن میں ٹیس پھوٹ رہی ہے۔

"اب کیا ہوگا؟" اس کے والد کی آواز بھرائی ہوئی سنائی دی۔ "ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ ہائے۔" انہوں نے اپنے ہی دونوں ہاتھ زور سے منہ پر مارے۔

"یہ سننے سے پہلے مجھے موت ہی کیوں نہ آ گئی؟" اس کی ماں نے نظریں اٹھائیں۔ اس کا خاوند اپنا منہ، پیٹھ اور بال نوچ رہا تھا۔ طمانچوں کی آوازیں گونج کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھیں۔

اس نے جھپٹ کر خاوند کے دونوں ہاتھ تھام لیے:

"تم اس بیسوا کے پیچھے کیوں اپنی جان دے رہے ہو؟ جو ہونا تھا ہو گیا۔"

"لیکن اس سے پوچھو تو سہی۔ اس کی یہ حالت کس نے بنائی؟"

"موت پڑی کچھ تو بھونک!" اس کی ماں نے پلٹ کر پوچھا۔ "اب کیوں تجھے سانپ سونگھ گیا؟ کچھ تو کہہ جہنم جلی؟"

اس کی ماں نے چپل اس کے منہ پر مار دی۔ اور دوڑ کر چولھے کی جلی ہوئی لکڑی

اٹھائی۔ تڑاتڑ لکڑی اس پر پڑنے لگی۔ لکڑی ٹوٹی تو ہاتھ چلنے لگا۔

"بول جلدی بول" اس کی ماں گرجی۔ "کس کم بخت سے یہ گناہ مول لائی ہے؟"

اس کا توازن بگڑنے لگا۔ دیوار پیٹھ سے لگنے لگی۔ اور اوپر سے اس کی ماں کی لات نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ وہ منہ کے بل زمین پر آرہی۔ اس کا سر نیچے گڑی ہوئی چکی سے ٹکرا گیا۔ زبان دانتوں تلے آکر کچلی جا چکی تھی۔ اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"بتا بے حیا۔" ٹوٹی لکڑی اس پر آگری۔

"تو۔ تو۔" اس کے بعد پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب وہ ہوش میں آئی تو کھولی میں کوئی نہ تھا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا، لیکن اس سے کروٹ بھی بدلی نہ گئی۔ زمین پر پھیلا ہوا خون دیکھ کر اس کا سر چکرانے لگا۔ اور دونوں ٹکے ہوئے ہاتھ پھسل گئے۔ اور پھر ایک مرتبہ اس کا سر زمین سے جا لگا۔

کئی دن تک وہ کھاٹ پر پڑی رہی۔ اس کو اپنے بچ رہنے پر بڑا ہی افسوس ہوا۔ اس کی ماں نے نہ جانے کیا کیا تدبیریں کیں۔ کتنی ہی چیزیں کھانے کے بعد اس کا پھوٹتا ہوا گناہ کا پودا جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا۔

یہاں تک آکر اس کی سانس زور زور سے چلنے لگی۔ بری طرح اس کا جی گھبرانے لگا۔ اسے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھول دی۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور کھنکارتے ہوئے ایک طرف زور سے تھوک دیا۔

ٹن ٹن ٹن ــ پاٹھ شالا کی گھنٹی ایک مرتبہ پھر شور مچانے لگی۔ گھنٹی بجتے ہی بچے چلاتے ہوئے بھاگتے ہوئے پھاٹک سے نکلنے لگے۔

اجاڑ میدان میں زندگی رینگنے لگی۔ بچے بغلوں میں کتابیں اور سلیٹ دابے اپنے اپنے گھروں کے راستے پر آگئے۔ برف والا گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگا۔ کچھ ہی دیر میں چپراسی پاٹھ شالا کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ بچوں کے بادل چھٹ چکے تھے۔

اسے بھی بھوک ستانے لگی۔ اس نے تھیلی کا منہ بند کرتے کرتے کچھ چنے منہ میں رکھ لیے اور اپنے نیچے رکھا ہُوا ٹاٹ اٹھایا اور اس کا ایک سرا تھام کر ہلکے ہلکے جھٹکے دیے۔ دھول پھیلنے لگی۔ اس نے ٹاٹ ٹوکری پر ڈھانپ دیا۔ گھوم کر اس نے اپنی کمر سیدھی کرنی چاہی لیکن جلد ہی اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ گر پڑے۔

اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا، اسے بکری دُور تک نظر نہ آئی۔ اس نے لگاتار دس بیس آوازیں لگائیں۔ لیکن کسی بھی سمت سے بکری اسے اپنی طرف دوڑتی ہوئی نظر نہ آئی۔

اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے ٹوکری سر پر اٹھائی اور سڑک پر آگئی۔ لیکن یہاں بھی بکری نہ تھی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔

کٹی ہوئی پتنگ کی طرح وہ ڈولتی ہوئی راج باڑے کی طرف چلی گئی۔ جب وہ راج باڑے کے کانجی ہاؤس دفتر سے پوچھ تاچھ کر کے آ رہی تھی تو اس کے چہرے سے غم کے آثار نمایاں تھے۔ چوراہے والی گلی میں اس کو غلام رسول مل گیا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں یہ جان لیا کہ وہ بہت ہی غمگین اور متفکر ہے۔

"کیا ہوا؟ — بائی!" اُس نے دریافت کیا۔

"میری بکری۔"

"کیا ہُوا بکری کو؟"

"بند کر دیا۔" اس کی آواز بھر آگئی۔

"کس نے؟" غلام رسول نے اس پر تعجب کیا۔

"گھسیٹا نے۔"

اُس نے پوچھا:

"جاگیردار نورالدین کے نوکر نے!"

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔ "کہتے ہیں بکری نے ان کے گھر میں گھس کر اناج

کھالیا تھا، اس لیے انہوں نے اسے کانجی ہاؤس پہنچا دیا۔"

"اسی لیے تو میں کہتا ہوں۔" اسے موقع ملا۔ "وہ ظالم ہیں۔ ان کو کسی پر بھی ترس نہیں آتا۔ انہی حرکتوں سے انہوں نے نہ جانے کتنے لوگوں کا دل دکھایا ہوگا۔ اب دیکھو نا تمہاری بکری ان کا ایسا کون سا خزانہ کھا گئی تھی جو انہوں نے اس کو کانجی ہاؤس میں پہنچا دیا۔ بکری چھڑالی؟"

"کہاں سے چھڑاتی بھیا؟" بکری والی بائی نے ڈھلکتے آنسوؤں کو صاف کیا۔ "کھانے کو تو پاس کچھ نہیں۔ صبح سے بھوکی ہوں۔ اور پھر وہ تو دس روپے مانگتے ہیں، اگر چھ ماہ کے اندر اندر بکری دوبارہ کانجی ہاؤس نہ آئی تو روپے واپس مل جائیں گے ورنہ نہیں۔ قانون ایسا ہی ہے ہم کیا کریں۔ بھیا اگر پہچان ہو تو بکری چھڑادو، دعائیں دیتی رہوں گی۔"

"ضرور ضرور کیوں نہیں۔" اس نے گردن ہلائی۔ "میں تو ہمیشہ ہی تمہاری خدمت کرنے کو تیار ہوں۔ مگر تم ہی موقع نہیں دیتیں۔ چلو تمہاری بکری تو میں ابھی چھڑائے دیتا ہوں۔ مگر ہمارا کام۔"

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ کچھ نہ بولی۔ غلام رسول کی طرف دیکھتی رہی۔

"بولو منظور ہے؟ دیر کروگی تو پیسے بڑھتے جائیں گے۔ دو دن اور نہ چھڑاؤ گی تو اپنی رقم کی وصولی کے لیے وہ بکری نیلام کر دیں گے اور تم دیکھتی کی دیکھتی رہ جاؤ گی۔"

اتنا سننا تھا کہ اس کا چہرہ مرجھا گیا اور اس کے دل میں طرح طرح کے خیال ابھرنے لگے۔ کچھ جواب دیے بغیر وہ آگے بڑھ گئی۔ غلام رسول نے بھی اس کو روکنا مناسب نہ سمجھا۔

ابھی شام اچھی طرح ڈھلنے بھی نہ پائی تھی کہ غلام رسول اپنے ساتھی کے ہمراہ بکری والی بائی کی کھولی پر پہنچ گیا۔ کھولی کے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ وہ آواز

دیے بغیر اندر داخل ہو گئے ۔ انہوں نے دیکھا بکری والی بائی آنکھیں بند کیے پیشانی پر ترچھا ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی ہے ۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا ہے ۔۔۔ اس کی سانس سے ہچکیوں کا گمان ہوتا تھا ۔

" کیوں ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ " غلام رسول نے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا ۔

بائی نے چونک کر ہاتھ ہٹایا ۔۔۔ اور غلام رسول نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے لبالب بھرے ہوئے تھے ۔ اس کے لبوں کے کنارے کپکپا رہے تھے اور آنکھوں کے نیچے والی ہڈی کا گوشت تھرتھرا رہا تھا ۔

" نہیں ۔ ابھی تک کچھ نہ ہو سکا ۔ میں نے بہت کوشش کی مگر کہیں سے کچھ نہ ملا ۔ " اور وہ رو پڑی ۔

" تم نے مجھے کیوں نہ کہلوایا ۔ میں تمہاری بکری چھڑا لاتا ۔ " اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا ۔ " اس میں گھبرانے کی اور رونے کی کیا بات ہے ؟ ارے میں کہتا ہوں میں جب تک زندہ ہوں تمہیں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں سمجھیں ! آگے بھی تمہارے کام آتا رہوں گا ۔ تم کو کئی مرتبہ کہا کہ محلوں میں رہنے والوں کا بھروسہ نہ کیا کرو ۔۔۔ ان سے فائدے کے بجائے نقصان ہی ہوتا ہے ۔ "

پھر اور بھلاتے ہوئے کہنے لگا :

" جب جاگیردار نے تم پر رحم نہ کھایا تو تم کیوں رحم کھا رہی ہو ؟ اب بھی وقت ہے ۔ آج ہی یہ کام ہو جائے ۔ ورنہ بکری ہاتھ سے گئی سمجھو ۔ "

" ہاں ہاں بائی ! اس میں تمہارا جاتا کیا ہے ؟ " غلام رسول کے ساتھی نے بھی اڑ لگائی ۔ جاگیردار صاحب سے ہم سب کا بدلہ لے لو کہ وہ زندگی بھر یاد رکھیں ۔ "

" پھر ماں رہی نا ؟ دیکھو نہیں تو بکری نیلام پر چڑھ جائے گی پھر ہم کو دوش

نہ دینا کہ ہم نے تمہاری مدد نہ کی۔ ہم تمہارے کام نہ آئے۔ مَیں روپے ساتھ لایا ہوں۔ اس سے تم اپنی بکری بھی چھڑا لینا۔"

"مَیں ابھی کچھ نہیں کہتی۔" بکری والی بائی نے کہا۔

غلام رسول نے اسے آگے بولنے کا موقع نہیں دیا، کہنے لگا:

"اب یہ نانا ختم کرو۔ یہ روپے رکھے ہیں کھانا وغیرہ کھاکر ابراہیم سیٹھ کے مکان پہ آجانا، وہیں پہ پروگرام طے کر لیں گے۔"

اس سے پہلے کہ بکری والی بائی کچھ کہتی، وہ دروازے سے باہر ہو گئے۔

رات بیت چکی تھی۔ سورج طلوع ہوئے مشکل سے ایک گھنٹہ ہوا ہوگا۔ گوالڈی روزمرّہ کی طرح جاگ چکی تھی۔ سینے اور بازوؤں کے زور زمین کی تہہ سے پانی کھینچ رہے تھے۔ رات کے جھوٹے برتن رگڑے جا رہے تھے۔ بلا امتیاز چھوٹے بڑے کپڑے جو گندے تھے وہ بالٹیوں میں پڑے بھیگ رہے تھے۔ چاروں طرف پھیلا ہوا کوڑا کرکٹ جھاڑا جا رہا تھا۔ ایک بڑے میاں ایک بچے کی شرارت پر جل بھن کر اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ پھاٹک پر وہ غلام رسول سے ٹکراتے بچے۔

"بکری والی بائی کہاں ہے؟" اس نے اسے کھولی میں نہ پاکر پڑوسن سے سوال کیا۔

"مَیں نے تو نہیں دیکھا۔" پڑوسن نے جواب دیا۔ "صبح ہی سے نظر نہیں آرہی ہے۔"

"کہاں گئی ہوگی؟"

"مَیں کیا کہہ سکتی ہوں۔" پڑوسن بولی۔ "رات بہت اُداس تھی۔ بات بات پر اسے رونا آرہا تھا۔ جاگیردار صاحب کی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے نا! ارے ہاں! ہوسکتا ہے وہ کانجی ہاؤس گئی ہو، کیوں کہ رات کہہ رہی تھی کہ وہ صبح ہوتے ہی اپنی بکری چھڑا لے گی۔"

"اچھا۔"

اتنا کہہ کر غلام رسول پھاٹک کی طرف مڑ گیا۔ باہر اس کا ساتھی اس کا انتظار

کر رہا تھا۔ دو سائیکلیں درخت سے ٹکی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھی نے قریب پہنچ کر پوچھا:

"کہاں ہے۔ رات کیوں نہیں آئی؟"

"چلو جلدی چلو۔ فریدہ کی شادی۔" اس نے تیزی سے سائیکل آگے بڑھادی۔

راج باڑے کی طرف ان کی سائیکلیں تیزی سے پھسلنے لگیں۔ راج باڑے کا راستہ مشکل سے پندرہ منٹ کا ہوگا۔ راج باڑے سے ملا ہوا کانجی ہاؤس کا دفتر کھلا ہوا تھا ۔۔ وہ سائیکل کھڑی کرکے دفتر میں گھس گئے۔ دفتر میں ایک چپراسی ٹیبل پر بیٹھا بڑی پی رہا تھا۔

"منشی جی کہاں ہیں؟ یہاں کوئی بوڑھی عورت آئی تھی؟"

"ادھر ہیں۔" چپراسی نے ہاتھ کا اشارہ کیا جدھر جانور بند کیے جاتے ہیں۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"پولس تحقیقات کر رہی ہے۔"

"کس بات کی؟"

"تم خود دیکھ لو۔ میں تو کچھ نہیں جانتا۔"

وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ کانجی ہاؤس کے پاس لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ لوگ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بٹے باتیں کر رہے تھے۔ ایک طرف میز پر سب انسپکٹر صاحب سامنے کھڑے ہوئے شخص سے پوچھ تاچھ کر رہے تھے، اور تین سپاہی ادھر ادھر پھیلے عوام کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔

وہ دونوں بھیڑ میں جا لگے اور غلام رسول نے ایک صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا:

"کیوں بھائی۔ کیا بات ہے؟"

"کسی کی لاش پڑی ہے۔"

"لاش!" اس نے تعجب سے دہرایا۔ "کیسی لاش؟"

آدمی بولا :

"معلوم نہیں کیا ہُوا؟ چوکیدار کو معلوم ہے ۔ وہ سامنے کھڑا اپنا بیان لکھوا رہا ہے ۔ اتنا معلوم ہے کہ چوکیدار جب پہرہ دیتا ہُوا یہاں آیا تو وہ لوہے کے جنگلے سے کھڑی کراہ رہی تھی ۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ داب رکھا تھا ۔ چوکیدار نے بہت کچھ پوچھا ۔ مگر اس کے کچھ بتانے سے پہلے اس کی رُوح پرواز کر گئی ۔ کہتے ہیں اس کی بکری یہاں بند تھی ۔"

"اوہ !" اس نے جلدی سے بڑھ کر سامنے پڑے ہوئے مُردہ جسم پر نظریں ڈالیں ۔

بکری والی مائی کی لاش بے حس و حرکت ، ساکت اور خاموش جنگلے کے باہر پڑی تھی اور جنگلے کے اندر بکری چلّا رہی تھی :

"ماں ۔ آں ۔ میں ۔ میں ۔ ایں ۔"

●●

نیا قانون

شری جمنا داس اختر کے نام

مکرمی

"سویرا" کے جمہوریت نمبر کے لیے "نیا قانون" لے کر حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں۔ یہ افسانہ دراصل سعادت حسن منٹو کے افسانے "نیا قانون" کا دوسرا روپ ہے۔ منٹو مرحوم کا افسانہ آزادی کے متعلق تھا جس کا مرکزی کردار "منگو کوچوان" تھا اور میرے افسانے کا مرکزی کردار "زلّو خاتون" ہے۔ یہ افسانہ اس نئے قانون کے متعلق ہے جو پہلی مئی ۵۸ء سے ہندوستان میں عصمت فروشی کی روک تھام کے لیے نافذ کیا گیا ہے لیکن آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ اس قانون پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے۔

نیاز مند

اختر پرویز

زلو خاتون ایک سال سے برابر نور افزا چودھرائین کے ہاں کی لونڈیوں کی "بڑی آپا" بنی ہوئی تھی۔

نور افزا کا اپنا اصول تھا کہ جب بھی اس کے ہاں کی کوئی رنڈی بازار میں بری طرح مقبول ہو جاتی تو وہ اسے بڑی آپا کا خطاب دے دیتی۔ پھر بڑی آپا کا حکم باقی رنڈیوں پر چلتا لیکن اس سکہ پر تصویر بڑی آپا کی رہتی۔

اس ایک سال میں کوئی دوسری رنڈی زلو خاتون سے اس کا اعزاز نہیں چھین سکی۔ ظاہر ہے کہ بازار میں اس کی مانگ ابھی زیادہ تھی۔

نور افزا چودھرائین کا مکان "ہیرا منڈی" میں "بڑے مکان" سے پکارا جاتا ہے اوپر نیچے چھ کمرے اور ایک بڑا ہال ہے۔ ان کمروں میں ایک نہ ایک رنڈی ہر وقت موجود رہتی ہے۔ نور افزا ان سے باقاعدہ کرایہ وصول کرتی ہے۔

اس نے ان رنڈیوں سے جو نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھانے کے بعد یہاں پناہ لینے آگئی تھیں، عجیب عجیب معاہدے کر رکھے ہیں کسی سے دن مقرر تھا۔ کوئی نقد روپیہ دیتا۔ کسی کا آمد و رفت پر حساب ہوتا اور کوئی اپنی ساری کمائی کا آدھا حصہ اس کی نذر کر دیتا۔

بڑے کمرے میں چودھرائین ہر آنے والے گاہک کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کرتی۔ اور جس رنڈی کو مناسب سمجھتی اس کا نام لے کر پکارتی اور کہتی:

"لے۔ تیرے سیٹھ آئے ہیں ـــــ" اور پھر وہ ان سیٹھ صاحب کو اس

رنڈی کے سپرد کر کے کسی نئے گاہک کے انتظار میں آنکھیں بچھا دیتی۔

زنّو خاتون ہزاروں میں ایک تو نہ تھی، لیکن سو دو سو میں اس کے جیسی متناسب اعضاء اور گداز بدن عورت ڈھونڈ نکالنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ وہ دوسری رنڈیوں جیسی ذلیل اور بچکانہ حرکتیں نہیں کرتی تھی۔ اور یہی چیز اسے دوسری رنڈیوں سے ممتاز کرتی تھی۔

زنّو خاتون کو اپنے ماں باپ کا کچھ ہوش نہیں ۔ وہ کہاں اور کب پیدا ہوئی، کن ہاتھوں کے ذریعے وہ یہاں تک پہنچی اسے اس کا کوئی علم نہیں۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو اسی گھر میں خود کو برتن مانجھتے اور یہاں آنے جانے والے گاہکوں سے اتنّی دوانّی مانگتے پایا۔

نور افزا کہتی ہے کہ اس کا اصلی نام زلیخا خاتون ہے۔ لیکن ماں باپ کا اسے پتہ نہیں۔ کچھ لوگ اسے چند روپے میں بیچ گئے تھے۔

شروع میں کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن جیسے جیسے اس کا جسم بھرنا شروع ہوا تو لوگوں کی بھوکی نظریں اس کے جسم پر پڑنے لگیں۔ اب نور افزا کو بھی کچھ ہوش آیا، اس نے اسے بنانا اور سنوارنا شروع کیا۔ اور اب اس کو باقاعدہ یہ دھندہ سنبھالے ہوئے ایک سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔

زنّو خاتون ہیرا منڈی میں بڑی سمجھدار رنڈی مانی جاتی تھی۔ گو اس کی تعلیم صفر کے برابر تھی۔ بچپن میں اس نے قریب کی مسجد کے مُلّا صاحب سے الف ب کا سپارہ پڑھا تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہیرا منڈی کی رنڈیوں میں سب سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھنے والی شمار کی جاتی تھی۔ وہ باتیں اس ڈھنگ سے کرتی جیسے اسے ساری دنیا کی چیزوں کی معلومات ہے۔

شہر میں کیا ہوا؟ شہر کے باہر کیا ہونے والا ہے؟ ان باتوں کا تھوڑا بہت علم اسے اپنے گاہکوں سے ہو جاتا، پھر اپنی ذہنی سطح پر سوچ کر وہ رنڈیوں سے گفتگو کیا کرتی۔

پچھلے دنوں جب زنّو خاتون نے اپنے نئے گاہک سے ہیرا منڈی میں لگنے والی پابندی

کی بات سُنی تو اس نے حیدن بائی کے بھاری سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے مدبرانہ انداز میں پیشین گوئی کی تھی :

" دیکھ لینا تھوڑے ہی دنوں میں ہیرامنڈی میں گیارہ بجے کی پابندی لگ جائے گی ۔"

اور جب حیدن بائی نے دریافت کیا کہ ۔ پابندی کون لگائے گا ؟

تو اس نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا : "کانگریس لگائے گی اور کون ۔"

ہیرامنڈی میں گیارہ بجے رات تک آمدورفت کی پابندی لگ گئی ۔ اور ہر رنڈی کو یہ بات معلوم ہو گئی تو ہیرامنڈی میں جتنی رنڈیاں تھیں وہ دل ہی دل میں زہرہ خاتون کے "جانکار" ہونے کا اعتراف کر رہی تھیں ۔ اور زہرہ خاتون اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی فریدہ کے اپنے "بی لاڑو" کے ساتھ بھاگ جانے پر رائے زنی کر رہی تھی ۔

"بی لاڑو" کا لفظ اس کی بات چیت میں ضرور استعمال ہوتا تھا لیکن اس لفظ نے حقیقت کا روپ دھار کر کبھی اس کی زندگی میں قدم نہیں رکھا تھا ۔ یہ لفظ اس نے اپنے یہاں آنے والے ایک بی اے گاہک کی زبانی سُنا تھا ، تو اس کے اپنے ذہن میں شکر کی مٹھاس سی گھلتی محسوس ہوئی تھی ۔ وہ گھنٹوں اس لفظ کو دُہراتی اور لطف اندوز ہُوا کرتی ۔

اس دن دوپہر کو جب نور افزا کے دھرائین کے بڑے ہال میں رنڈیوں کی محفل جمی تو اس نے پاندان سے پان اٹھایا اور بڑی ادا سے کلّے میں دابتے ہوئے فلسفیانہ لہجے میں کہا :

" یہ آئے دن رنڈیوں کا اپنے ٹوٹ پونجیے سیٹھوں کے ساتھ بھاگ جانا کسی بھی زاویۂ نگاہ سے ٹھیک نہیں ۔ ہم ذرا غور کریں تو اس کے نتائج کا صحیح طور پر اندازہ ہو جائے کیا ہمارے یہاں سے چلے جانے سے ہیرامنڈی اُجڑ جائے گی ؟ کیا ہم یہاں سے چلے جائیں ، تو دوسری عورتیں رنڈیاں بنا کر بٹھا نہیں دی جائیں گی ؟ اور پھر ہماری اولادوں کا کیا ہو گا ؟ کیا یہ سب بھی سماج میں ویسا ہی درجہ پائیں گی جو دوسرے لوگوں کی اولادیں پاتی ہیں ؟ تو

تو پھر یہ پاگل پن نہیں، تو اور کیا ہے؟ یہ بازارِ حسن اسی طرح رہے گا۔ اس کی یہ رونق، یہ چہل پہل اسی طرح قائم رہے گی چاہے ہم نہ رہیں، کوئی اور رہے گا۔ میں نے سنا ہے کہ ایک بزرگ نے عورتوں کو بد دعا دی تھی کہ جاؤ تمہاری جنس ہمیشہ اپنی عصمتیں نیلام کرتی رہے گی اور دیکھ لو جب سے دنیا قائم ہے یہ دھندا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔

یہ بڑی بڑی باتیں وہ ایک ہفتہ سے اپنے یہاں آنے والے ایک سیاسی کارکن سے سنتی رہی تھی اور جب اس نے فریدہ کے بھاگ جانے کی بات سنی تو اس نے ان سب باتوں کو اس معاملے میں جوڑ دیا تھا۔

زہرہ خاتون کو سیٹھوں سے بڑی نفرت تھی۔ اس نفرت کی وجہ وہ یہ بتاتی تھی کہ وہ اس کے جسم پر من مانی کیا کرتے ہیں۔ مگر اس کے متنفر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ بازار انہیں کی وجہ سے چل رہا ہے۔ وہ خود کو رنڈی بنانے کا باعث بھی انہیں سیٹھ لوگوں کو ٹھہرایا کرتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے جیسے وہ ذلیل کتیا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا سیٹھیا پن پسند نہ تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ ان کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر مجھے وہ قصائی یاد آجاتا جو بے دردی سے بکری کے جسم سے کھال اتارا کرتا ہے۔

اکثر اس قسم کی گفتگو سے اس کی جھڑپیں ہو جایا کرتی تھیں۔ اور جب کسی بگڑے سیٹھ سے اس کی تو تو میں میں ہو جاتی تو ساری رات اس کی طبیعت مکدر رہتی، اور دوپہر کو چودھرائن کے بڑے کمرے میں پان لگاتے وقت یا سر گوندھتے ہوئے اس سیٹھ کا مذاق اڑایا کرتی۔

بھوکے بھیڑیے، کتے کے بچے۔۔۔ گالی دیتے ہوئے وہ کہتی کہ دو چار روپے دے کر سیٹھ لوگ یوں حکم چلاتے ہیں جیسے ہم ان کے نکاح میں بندھ گئے ہیں۔ کتوں کی اولاد ڈینگیں ماریں گے جیسے سکندر کے سامنے پورس مکالمے ادا کر رہا ہو۔ بھڑووں کو اداکاری بھی کرنی نہیں آتی۔ اسٹیج کے اداکار کہیں کے!"

اس پر بھی اس کا پارہ نہیں اترتا تھا۔ جب تک اس کے کمرے میں اس کی ساتھی رنڈی موجود رہتی وہ دل کی بھڑاس نکالا کرتی:

"صورت دیکھتے ہو نا تم اس کی۔ جیسے دق کا مریض ہو۔ بالکل بے جان۔ اور یوں چٹا چٹ بوسے لیتا ہے جیسے پورے گال چاٹ کھائے گا۔ میرا دل تو چاہنے لگا کہ بچہ جی کی ہڈیاں پسلیاں داب کر رکھ دوں ۔۔۔ لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ اس کم بخت کو مارنا اپنی ہتک ہے۔"

یہ کہتے کہتے وہ کچھ لمحوں کے لیے چُپ ہو جاتی، پھر اپنے چہرے پر جھومتی لٹ کو برابر کرتے ہوئے بڑبڑانے لگ جاتی:

"قسم خدا کی۔ ان سیٹھوں کے نخرے اٹھاتے اٹھاتے بیزار آ چکی ہوں۔ جب کبھی ان کی منحوس شکل دیکھتی ہوں طبیعت کھولنے لگ جاتی ہے۔ کوئی "نیا قانون" بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آئے۔"

اور جب ایک رات اس کے کمرے میں دو گاہک آئے اور ان کی گفتگو سے یہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو لیڈر قسم کے گاہک تو تھے ان کے ہاں آ گئے تھے، پان کھاتے ہوئے "نیا قانون" یعنی "انسداد عصمت فروشی ایکٹ" کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔

"سُنا ہے کہ پہلی مئی سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا۔"

"کیا ہیرا منڈی کی ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر بہت کچھ بدل جائے گا اور رنڈیوں کو نجات مِل جائے گی۔"

"کیا خفیہ اڈوں کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟"

"اس کے متعلق مجھے کچھ نہیں معلوم۔ کل کسی سے دریافت کریں گے۔"

ان دونوں گاہکوں کی بات چیت زتو خاتون کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ گھر میں کام کرنے والی نوکرانی کو گالیاں دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی مار پیٹ بھی دیا کرتی تھی۔

"جا بہن۔ جا بہن ذرا جلدی سے چائے والے کو بلا لا۔"

اور جب گاہک چلے گئے تو اس نے پیالی میں بچی ہوئی چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ پیا اور لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا:

"ہت تیری ایسی تیسی!"

دوپہر کو جب وہ اپنے کمرے سے بڑے کمرے میں آئی تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان والی کوئی رنڈی نہ ملی۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ آج وہ ایک بہت بڑی خبر اپنے ساتھ والیوں کو سنانے والی تھی۔ بہت بڑی خبر — اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے بہت بے چین ہو رہی تھی۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

آدھے گھنٹے تک وہ بالکنی میں بے قراری سے ٹہلتی رہی۔ وہ بہت اچھی باتیں سوچ رہی تھی۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

وہ اس نئے قانون کے متعلق جو مئی سے ہندوستان میں طوائفوں کے لیے نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہی تھی۔

وہ خوشی کے مارے جامے میں نہیں سما رہی تھی اس کے دل کو یہ سوچ کر بڑا سکون ملتا کہ یہ سیٹھ.... بھوکے کتے (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتی تھی) نئے قانون کے آتے ہی دُم دبا کر بھاگ جائیں گے۔

جب رادھا بغل میں ساڑی کا پلو دبائے دبائے ہال میں داخل ہوئی تو زتو خاتون اس سے بڑے تپاک سے ملی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بلند آواز سے کہنے لگی:

"آ! میری جان! الس... بتاؤں کہ تو پھڑک اٹھے۔ تیرے سوکھے جسم میں

ہوا بھر جائے اور تو گول گپا ہو جائے۔"

پھر زلّو خاتون نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنی سہیلی سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو اس نے بیسیوں بار اس کے جسم پر دھپ مارتے ہوئے کہا:

"دیکھا کیا بنتا ہے؟ یہ کیرالا کے وزیر کچھ نہ کچھ کر کے ہی رہیں گے۔"

زلّو کیرالا کے وزیروں کے متعلق بہت کچھ سن چکی تھی اور اسے کمیونسٹوں کی نئی تحریکیں اور جدّوجہد بہت پسند تھیں۔ اس لیے اس نے کیرالا کے وزیروں کو انسدادِ عصمت فروشی یعنی نئے قانون کے ساتھ ملا دیا تھا اور پہلی مئی کو جو پرانے سماجی ڈھانچے میں نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں، وہ انہیں کیرالا کے وزیروں کے اثر کا نتیجہ سمجھتی تھی۔

کچھ عرصہ سے دلّی اور دیگر شہروں میں سماج سُدھار کی تحریکیں چل رہی تھیں، زلّو خاتون نے اس جدوجہد کو اپنے دماغ میں "کیرالا کے وزیر" اور پھر نئے قانون کے ساتھ ملا دیا تھا۔

اس کے علاوہ جب وہ سنتی کہ فلاں جگہ رنڈیاں پکڑی گئیں یا فلاں جگہ اتنے آدمی گرفتار ہوئے تو ان باتوں کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔

ایک روز اس کے کمرے میں دو تعلیم یافتہ شخص بیٹھے نئے قانون پر بات چیت کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سُن رہی تھی۔

ان میں سے ایک دوسرے کو کہہ رہا تھا:

"نئے قانون کا حصہ آشرم ..... جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایسا آشرم تو دنیا میں کہیں نہیں بنا۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ آشرم ..... ہے۔ آشرم ہی برائی کی جڑ بن جائے گا۔"

ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی، چوں کہ ان میں بیشتر الفاظ ہندی کے تھے اس لیے

زلتو خاتون نے ادیب کے جملے کو ہی کچھ سمجھا اور اس کے دل میں خیال آیا ۔ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو اچھا نہیں سمجھتے اور چاہتے ہیں کہ ہم نجات نہ پائیں ۔

چنانچہ یہ بات سوچ کر اس نے کئی مرتبہ ان کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا : "عیاش بچے !"

اس واقعہ کے تیسرے روز تین شاعروں کو پان بنا کر دے رہی تھی تو اس نے شاعروں کو آپس میں بات چیت کرتے سُنا :

"نئے قانون نے میری خوشیاں بڑھا دیں ۔ حُسن کی رانی مِل گئی تو میں اسے گھر کی مالکن بنا دوں گا ۔"

"ویسے بہت سی خوب صورت عورتیں ملیں گی ۔ شاید اس گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کوئی آجائے ۔"

"ضرور ضرور ۔ کیوں نہیں ۔ وہ بن بیاہے ادیب و شاعر جو مارے مارے سڑکیں ناپتے پھرتے ہیں اُن میں کچھ تو کمی ہو جائے گی ۔"

اس بات چیت نے زلتو خاتون کے دل میں نئے قانون کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ، اور وہ اس کو ایسی بات سمجھنے لگی جو آسمان سے اُتری ہو ۔۔۔ "نیا قانون"

وہ رات میں بیسیوں مرتبہ سوچتی ۔ یعنی کوئی نئی بات ۔ اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے وہ ساز و سامان آجاتا جو اس نے بمبئی کی طوائفوں کے ہاں دیکھ کر خریدا تھا ، جب ساز و سامان نیا تھا ۔ جگہ جگہ نقش و نگاری کی گئی تھی ۔ وہ آئینہ کی طرح چمکتا ۔۔ اس لحاظ سے نئے قانون کا چمک دمک ہونا ضروری تھا ۔

پہلی مئی تک زلتو خاتون نے نئے قانون کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سُنا ۔ مگر اس کے متعلق وہ جو خیال قائم کر چکی تھی اس کو بدل نہ سکی ۔

اس کا خیال تھا کہ پہلی مئی کو نئے قانون کے آتے ہی تمام جھنجھٹ ختم ہو جائے گی ۔

اور اُمید تھی کہ اس کی آمد پر جو بات ہوگی ان سے دل کو سکون ملے گا۔

آخر کار اپریل کے ۳۰ دن پورے ہو گئے۔ وہ رات گئے تک نئے قانون کے متعلق سوچتی رہی۔ آج رات اس کے دل و دماغ میں سکون کی عجیب لہر تھی اور جب اس کے دل و دماغ کو کچھ ذرا سکون ملا تو بے تحاشہ نیند آنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نیند جو برسوں سے کھو گئی تھی وہ لوٹ آئی ہے۔ اور دنیا سے بے خبر نیند کی وادی میں کھو گئی۔ رات بھر وہ نئے قانون کے خواب دیکھتی رہی۔

قریب ایک بجے اس کی آنکھ کھلی۔ نور افزا اس کی زیادہ سونے والی عادت سے واقف تھی۔ شروع میں اس نے اسے جلد اٹھنے کی تنبیہہ بھی کی تھی، لیکن زہرہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اگر کوئی دوسری رنڈی ایسا کرتی تو نور افزا اس کا کچومر بنا دیتی۔ لیکن نور افزا اس کے معاملے میں ذرا ڈھیل دیتی تھی۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے اس کا کاروبار زور شور سے چل رہا تھا۔

نہا دھو کر اس نے وہ کپڑے پہنے جو اس نے اگلے ماہ ہی سلوائے تھے، اور بن سنور کر اس نے دو تین گھنٹے بڑی بے چینی سے گزارے۔ چار بجے گھر سے نکل کھڑی ہوئی کیوں کہ وہ بازاروں میں نئے قانون کو دیکھنے والی تھی۔

سڑک پر دھوپ تیز تھی۔ ہیرا منڈی کے نکڑ پر حلوائی اپنے چولھے کو سلگا رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن اسے کوئی بھی چیز نئی نظر نہیں آئی۔ وہی جانا پہچانا ماحول تھا۔ اس نے حلوائی کی دکان سے محمود پان والے تک دو چکر لگائے۔ لیکن اسے کوئی بھی چیز نئی نظر نہیں آئی۔ ہر چیز پرانی تھی۔ گلی میں لیٹے ہوئے سیّد بابا کی قبر کی طرح پرانی۔ صرف اس کے جسم پر ساڑی نئی تھی اور گلے میں پڑا موتیوں کا ہار نیا تھا۔ جو پچھلے دنوں ایک موٹر ڈرائیور دے گیا تھا جسے اس نے اسی دن کے لیے اٹھا رکھا تھا۔

ہیرا منڈی میں سے گزرتا ہوا گندے پانی کا نالہ ..... قریب کی ٹوٹی ہوئی چوکی

کسی بوڑھے کی طرح زندگی کے آخری دن گزارتا پیپل کا درخت، اور پھیری کرنے والے گاہک، سب پرانی چیزیں تھیں، لیکن زتو خاتون مایوس نہیں تھی۔ شام ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے، سب تو بیچنے والے بھی تو نہیں آئے۔ اتنا سوچ کر اسے کچھ تسکین ہوئی۔

اس کے علاوہ یہ بھی خیال کرتی تھی کہ نیا قانون رات کے بیوپاریوں کے لیے ہے، اس لیے رات ہی میں نظر آئے گا۔

مسجد کے قریب والی ہوٹل کھل چکی تھی۔ دن میں یہاں کوئی آمد و رفت نہیں ہوتی۔ لیکن شام ہوتے ہی سٹے کی بیٹ لینے والے آجاتے جس کی وجہ سے بڑی چہل پہل ہو جاتی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھ کر اطمینان کر لیا تھا کہ یہاں بھی نیا قانون دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ گہری سوچ میں غرق راج ٹاکیز کے راستہ پر ہولی۔ راستے میں جب بھی اس کی نظریں اٹھتیں وہ بڑے اشتیاق سے نئے قانون کو تلاش کرتی لیکن کہیں بھی نظر نہیں آتا تھا۔

راج ٹاکیز کے آس پاس بھی اسے نیا قانون نظر نہیں آیا۔ جو پکچر چل رہی تھی اسے بھی لگے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ اس نے سینما کی عمارت پر نئے فلموں کے پوسٹر دیکھنے چاہے، لیکن وہاں بھی ہزاروں بار دیکھے ہوئے پوسٹر چپاں تھے۔

وہ چاہتی تھی کہ آج کوئی اچھی فلم لگے جسے وہ ہنسی خوشی دیکھنے جائے۔ جب فلم زیادہ دن چلنے لگتی تو اسے ایک قسم کی الجھن ہونے لگتی۔ وہ ہر بات میں خوشگوار تبدیلی چاہتی تھی کہ فلمیں بھی دوسرے تیسرے دن بدل جایا کریں۔

اور جب اس نے فرشتہ فلم کے پوسٹر دیکھے تو اسے ایک قسم کی جھنجلاہٹ ہوئی پہلی بات تو یہ کہ اس فلم کو لگے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے۔ دوسری یہ کہ اس فلم میں سہراب مودی تھا۔ وہ اس ایکٹر کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ جب بھی وہ اسے کسی فلم میں مکالمے ادا کرتے دیکھتی تو اسے اپنے گاہک، یاد آجاتے جو اس کی صورت دیکھتے ہی رٹے رٹائے جملے دہرانے لگ

جلتے تھے۔

وہ بہت جلد راج ٹاکیز کے اونگھتے ماحول سے تنگ آ گئی۔ وہ واپس ہو گئی کیوں کہ شام ہو چلی تھی۔ جب وہ ہوٹل کے نزدیک پہنچی تو اسے کسی نے پکارا:

"اِدھر کدھر میری جان!"

آواز پر اس نے اپنی نظریں ہوٹل کے نکڑ پر کھڑے ہوئے شخص پر ڈالیں۔ اس نے دیکھا ایک شخص کوٹ پتلون میں ملبوس جھک کر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ سگریٹ سلگا کر مڑا، زلتو نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔

زلتو نے منہ سکیڑ کر سامنے کھڑے شخص کو دیکھا۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ اسے کوئی سخت جواب دے دے لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ آج اس مبارک دن کسی سے کوئی تکرار نہیں کرنی چاہیے۔ وہ سر جھکائے آگے بڑھ گئی۔

"آج کدھر؟ اس ساڑی میں تو بڑی جچ رہی ہو۔"

سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے سیٹھ نے کہا:

"چلوگی نا۔ یا پھر نخرے بتاؤ گی۔"

"وہی ہے —" زلتو خاتون کے ذہن میں یہ الفاظ ابھرے اور سینے کے اندر دوڑ مچانے لگے۔

"وہی ہے" اس نے منہ کے اندر یہ الفاظ دُہرائے — اس کا خیال یقین کی حد تک پہنچ گیا — کہ سامنے جو سیٹھ کھڑا ہے وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہو چکی تھی — اور بلاوجہ جھگڑے کا باعث وہ انگریزی شراب تھی جس کی ایک بوتل وہ ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔

اس جھگڑے میں اسے بہت سی باتیں برداشت کرنا پڑی تھیں۔ زلتو خاتون نے اس سیٹھ کی طبیعت درست کر دی ہوتی بلکہ اسے اپنی بالکنی سے نیچے پھینک دیا ہوتا اگر اس کو کچھ

باتوں کا خیال نہ ہوتا۔

زتو خاتون نے پچھلی لڑائی اور پہلی مئی کے قانون پر خیال آرائی کرتے ہوئے کہا:

"کہاں چلتا ہے ـــــ"

زتو خاتون کے لہجے میں تیز چاقو کی دھار تھی۔

سیٹھ نے کہا:

"ہمارے بنگلے لے جائیں گے....."

"وہاں تمہاری ماں بہن نہیں ہے کیا۔؟" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا نچلا لب دانتوں کے درمیان دبا لیا۔

"کیوں ـــ چلتی ہو یا گھسیٹتے ہوئے لے جاؤں؟"

"جا۔ بڑا آیا۔ لے جانے والا۔" زتو نے سخت لہجے میں کہا۔

سیٹھ اگلے وقت کے واقعے کے پیش نظر زتو خاتون کے لہجے کی سختی کو نظر انداز کر گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ خود میں ہمت پا کر وہ اس کی طرف بڑھا اور اپنی چھڑی سے نور افزا کے مکان کی طرف چلنے کا اشارہ کرنے لگا۔

سینے پر پڑے ہوئے پلو سے چھڑی چھو رہی تھی۔ زتو نے سر سے پیر تک سیٹھ کو دیکھا، گویا وہ اسے نگاہوں کے تیر سے چھلنی کر ڈالنا چاہتی ہے۔

پھر اس کا ہاتھ تیزی سے گھوما اور چشم زدن میں سیٹھ کے گال پر پڑ گیا۔

اس نے دونوں ہاتھ سے سیٹھ کے سینے پر دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹایا۔ چھڑی سیٹھ کے ہاتھ سے اچھل کر دور جا پڑی۔ اور وہ اس پر جھپٹ پڑی۔

ششدر اور متحیر سیٹھ نے اِدھر اُدھر جھک کر زتو خاتون کے طمانچوں سے بچنے کی کوشش کی۔ اور جب دیکھا کہ زتو خاتون پر ایک قسم کا جنون سوار ہے۔ اس کی آنکھیں غصے میں لال ہو رہی ہیں تو اس نے گلے کا زور لگا کر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس کی یہ چیخوں

نے زلّو خاتون کی چھینا جھپٹی کے کام کو اور تیز کر دیا۔

وہ جی بھر کر اسے نوچ کھسوٹ رہی تھی اور یہ کہتی جا رہی تھی :

" پہلی مٹی کو بھی دہی اکڑفوں ؟ اب جمہوریت کا راج ہے عیاشی نہ کیجیے ! "

رنڈیاں اور دیگر لوگ جمع ہو گئے ۔ دو ایک رنڈیوں نے بڑھ کر بڑی مشکل سے زلّو خاتون کو اپنے قابو میں کیا۔

زلّو بپھری ہوئی شیرنی کی مانند ان کے درمیان کھڑی ہوئی تھی ۔ اس کا سینہ نیچے اوپر ہو رہا تھا ۔ چہرے پر اس کی لٹیں اُڑ رہی تھیں ، اور وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے رنڈیوں کی طرف دیکھ کر رک رک کر کہہ رہی تھی :

" وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے ۔ اب نیا قانون ہے میاں نیا قانون ۔"

اور بے چارہ سیٹھ اپنے نُچے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی زلّو خاتون کی طرف دیکھتا اور کبھی دوسرے لوگوں کی طرف ۔

زلّو خاتون کو نور افزا پکڑ کر اس کے کمرے میں لے گئی ۔ کمرے میں جاتے وقت وہ " نیا قانون " چلّاتی رہی :

" نیا قانون ۔ نیا قانون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " مگر کسی نے ایک نہ سُنی ۔

" نیا قانون ـــ کیا بک رہی ہے ۔ قانون وہی پُرانا ہے ۔"

زلّو خاتون پاگل ہو گئی تھی ۔ پاگل خانے میں وہ شور مچاتی رہتی :

" نیا قانون ـــ اب کوئی شخص عورت کی عصمت نہیں خرید سکتا ۔ کوئی اس کی عصمت فروشی نہیں کر سکتا ۔ عصمت فروشی کے تمام اڈّے بند ہو جائیں گے ۔ نئے قانون کے نتیجے میں بدکاری ختم ہو جائے گی ۔"

دو ماہ کے بعد وہ تندرست ہوئی ۔ اب وہ کہاں جاتی ۔ ڈاکخانے میں کچھ روپے

تھے۔ اسے نکلوا کر وہ گاؤں چلی جانا چاہتی تھی۔ ڈاکخانہ کے نزدیک ایک پُرانا گاہک مل گیا۔ اس نے سیٹی بجا کر آنکھ سے اشارہ کر کے کہا:

"چلے گی میری سرکار۔"

زلّو نے دو تین گالیاں دیں۔

پھر وہ گاؤں پہنچی۔ تیسرے دن ہی اس کے خلاف محلہ والوں نے رپورٹ بھیجی، پولس کو طلب کیا۔ گاؤں والوں کو شکایت تھی کہ ایک فاحشہ عورت گاؤں میں آ گئی ہے۔ اسے گاؤں سے نکال دیا گیا۔

وہ شہر میں آ گئی ــــ وہی ــ وہی مسکراہٹیں، نوٹوں کی جھلکیاں، سکّوں کی جھنکار ..... زرینہ .... اُرمیلا مل گئیں۔ زرینہ نے کہا:

"آؤ ــــ!"

زلّو خاتون نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ زرینہ کہنے لگی:

"وہم نہ کرو زلّو .... ہمارا کاروبار بند نہیں ہُوا۔ اب ہم نے سنگیت گرلز ایسوسی ایشن قائم کر لی ہے۔ ہمارے سرپرست ایک لیڈر ہیں۔ گانے کی آڑ میں ہمارا کاروبار چل رہا ہے۔"

بملا نے کہا:

"میرے آدمی نے گاندھی نگر میں پرائیویٹ اڈّہ کھول لیا ہے۔ وہاں پر شریف قسم کے لوگ آتے ہیں، وہ ہمارے مددگار ہیں ــــ قانون کے بازو اُن تک نہیں پہنچ سکتے۔"

زلّو نے کہا:

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"تو بھوکی مرے گی کیا؟"

"ہاں ! بھوکوں مرجاؤں گی مگر عصمت فروشی نہیں کروں گی۔"

زرینہ اور بملا کہہ کر چلی گئیں۔ زنّو کو کہیں پناہ نہیں ملی۔

ایک ماہ بعد پھر وہ پاگل ہو گئی تھی۔ اسے پھر پاگل خانے میں داخل کرایا گیا تھا۔ وہ چلّا چلّا کر کہتی:

"سیٹھ تمہارے بنگلے پہ چلوں گی ۔۔۔ بملا تمہارے مکان پہ رہوں گی ۔۔۔ زرینہ ۔۔۔ تم ٹھیک کہتی ہو ۔۔۔"

اور پھر قہقہہ بلند کرتی ۔۔۔ "نیا قانون ۔۔۔"

••

نظریں کمرے کا جائزہ لینے لگیں ... اُجلے غلاف والے تکیے قرینے سے دائرے کی شکل میں رکھے ہوئے تھے۔ اس کے مقابل سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی اور بالکل سرے پر دیوار سے ذرا ہٹ کر ایک خوبصورت قالین فرش سے چپکا پڑا تھا۔ دیواروں پر چاروں طرف ایکٹروں اور ایکٹرسیوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔

ریحانہ جہاں بیٹھی تھی اس کے داہنے طرف سازندے اپنے سازوں کو ٹھیک کر رہے تھے۔ چھت پر چار ٹیوب جل رہے تھے جن کی ٹھنڈی روشنی قالینوں اور گاؤ تکیوں پر ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے چودھویں کے چاند کی ہوتی ہے۔

کچھ دیر بعد ریحانہ ناچ رہی تھی۔ کمرہ کا ذرّہ ذرّہ جیسے اس کے ناچ اور گانے کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔ پورے کمرے پر رقص و نغمہ کا جادو چھایا ہوا تھا۔ واہ واہ کا شور بلند ہونے لگا۔ لوگوں کی جیب سے نوٹ نکلنے لگے۔ ریحانہ جھک جھک کر سلام کرتی اور نوٹ بٹور کر روپہلی تھالی میں رکھ دیتی۔

ہر ایک ترنگ میں جھک رہا تھا، مگر حمید ایک پتھر کی مورت کی طرح ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی ڈرتے ڈرتے نظر اٹھاتا، کچھ لمحہ رقاصہ کی طرف دیکھتا پھر نظریں نیچی کر لیتا۔ وہ اس طرح کھویا ہوا تھا کہ نہ تو اس کے منہ سے کوئی تعریفی لفظ نکلا اور نہ ہی اس نے نوٹ دیے۔

اس کی اسی کیفیت کا نتیجہ تھا کہ ریحانہ بھی پورے طور پر اس کی طرف متوجہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ریحانہ کی ساری کوششیں اسی کو لبھانے کے لیے ہیں۔ پھر وہ تھک کے بیٹھ گئی۔ گانا بند ہو گیا۔ اور پھر بات چیت کا دور شروع ہوا۔ لیکن حمید کو جیسے ان سب باتوں سے کوئی مطلب نہ تھا۔ وہ صرف ٹکٹکی لگائے ریحانہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کے دوستوں نے اسے چونکا دیا۔ وہ سب باہر نکل آئے۔ راستے میں حمید نے کوئی بات نہ کی۔

گاہے گاہے ریحانہ کے ہاں جانا روز کے جانے میں بدل گیا۔ ریحانہ بھی اس

میں دلچسپی لینے لگی۔ حمید اب لوگوں کی طرح کمرے میں نہیں بیٹھتا تھا، بلکہ ریحانہ کی خواب گاہ میں بیٹھا رہتا۔ ریحانہ اپنا کام جلد ختم کر کے آجاتی اور پھر وہ دونوں یونہی فضول محبت اور عشق کی باتیں کیا کرتے۔

وہ اکثر سوچا کرتا۔۔۔ کیا واقعی طوائف بھی عشق کر سکتی ہے؟ کیا مجھے اس سے عشق ہوتا جا رہا ہے؟ ریحانہ کون ہے؟ ریحانہ طوائف کیوں بنی؟

جب وہ ان سوالوں کا جواب نہ پاتا تو ریحانہ سے پوچھ بیٹھتا کہ تم نے یہ ذلیل پیشہ کیوں اختیار کیا ـــــ آج بھی وہ اس کی خواب گاہ میں بیٹھا اس کی آپ بیتی سن لینے پر بضد تھا۔ ریحانہ نے طرح طرح کے بہانے تراشے مگر سب بے سود۔ ایک بہانہ بھی اس کا کارگر نہ ہوا۔ وہ انکار کرتی رہی، مگر حمید اپنی ضد پر اڑا رہا۔

"میں تمہاری زندگی کے بارے میں جان کر ہی رہوں گا۔" حمید نے کہا "تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔ ورنہ۔۔۔۔"

"تم بضد ہو تو سنا ہی دیتی ہوں۔" ریحانہ نے جواب دیا۔

"میں ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ ابّا ایک رئیس کے ہاں نوکر تھے۔ ایک بڑا بھائی تھا جس نے پڑھائی لکھائی میں دلچسپی نہ لی۔ بُرے لوگوں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ ماں بے چاری سیدھی سادی بالکل مسلمان قسم کی بی بی تھیں۔ روزہ نماز، چولھے چکّی میں لگی رہتیں۔ میری تعلیم بھی بس واجبی تھی۔ بس اتنی جتنی ایک شریف مسلمان لڑکی کی ہونی چاہیے۔ زندگی کے دن مزے سے گزر رہے تھے۔

یکایک ابّا کا حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ گھر میں کچھ زیادہ پونجی نہیں تھی۔ بھائی آوارہ، ماں اس صدمہ سے نڈھال۔ میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ بھائی نے ایمان داری سے نوکری کے لیے کوشش کی مگر کہیں کوئی مستقل کام نہ ملا۔ پھر بھی روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتے رہے۔ بھائی کی بُری صحبت رنگ لائی۔ جوا کھیلتے ہوئے پکڑے گئے۔ آدمی

کو خرچ کرنے کے لیے روپیہ تو آخر چاہیے۔ جب ایمان داری اور محنت مشقت سے روپیہ حاصل نہیں ہوتا تو جوا کھیل کر، چوری کر کے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں کیا قصور تھا۔ خیر وہ تو جیل گئے اور گھر میں فاقے آ گئے۔ کچھ دن گھر کی ہانڈیاں برتن بیچ کر چولھا سلگایا مگر ایسا کب تک ہوتا؟

آخر بوڑھی ماں اور مجھے اس رئیس کے ہاں برتن مانجھنے اور جھاڑو لگانے کی نوکری کرنا پڑی۔ ابا جان زندگی بھر غلامی کرتے رہے تھے، اس لیے وہ ہم پر ذرا مہربان تھے۔ بوڑھی ماں آخر کب تک ساتھ دیتی؟ اس فکر میں گھل گھل کر مر گئی کہ کسی اچھے گھرانے میں میری شادی ہو جائے، مگر ان کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ ان کی ہر تمنا پر پانی پھر گیا۔ ایسی لڑکی سے بھلا کون شادی کرتا جس کی ماں برتن مانجھنے پر نوکر ہو۔ جس کا بھائی ایک نمبر کا بدمعاش ہو، یہ ہوتے ہوئے ہم ذرا مالدار ہوتے تو یہ پہاڑ سا عیب بھی رائی بن جاتا۔ کوئی بھولا بھٹکا آتا بھی تو اس کی شرطیں ایسی ہوتیں کہ مجبوراً ماں کو مایوس ہو کر پھر کسی اچھے بر کی آس ہوتی۔ آخر انہیں یہ آس لے کر ہی جانا پڑا۔"

ریحانہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ جنہیں وہ ڈھلکنے سے روکنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔

" وہ شام بھی کتنی منحوس شام تھی۔ ایک طرف میرے سامنے میری ماں کی نعش پڑی تھی اور دوسری طرف میرا مستقبل مرا پڑا تھا۔ میرا صرف ایک کام تھا رونا۔ صرف رونا، باہر موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ باہر آسمان رو رہا تھا اور اندر میں۔

مجھے تو کوئی ہوش نہیں تھا۔ رئیس کے صاحب زادے نے لاش کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا۔ مجھے بھی تسلی کے دو لفظ کہے۔ اب میں بالکل تنہا تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں میرا کوئی سہارا نہ تھا۔ میرا سہارا اب وہی رئیس تھے۔ ان کے صاحبزادے خاص طور پر مجھ پر مہربان تھے۔ بھلا جوان لڑکی پر کون مہربان نہیں ہوتا!"

"میرا جسم حاصل کرنے کے لیے اس نے طرح طرح کے لالچ دیے، دھمکیاں بھی دیں، اور پیار کی باتیں بھی کیں، دلہن بنانے کے وعدے بھی کیے۔ میں آخر کب تک بچ رہتی؟ بلاؤں کے سمندر میں ایک حقیر تنکے کی اوقات ہی کیا؟ میں بہہ گئی۔"

"دھیرے دھیرے وہ مجھ پر قابض ہوتا گیا۔ میرے سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔ رات کا اندھیرا جب کوئی روشنی نہیں پاتا تو ہر چیز پر چھا جاتا ہے اسی کے مانند وہ مجھ پر چھا گیا۔ اور دوسروں کو بھی چھا جانے کا حق دینے لگا۔ اگر انکار کرتی تو مارتا، کھانے کو نہ دیتا۔ اور کچھ کہا سنا تو دنیا میں بدنام کر دینے کی دھمکی دیتا۔"

"آخر رئیس کی جیت ہوئی اور میں ہار گئی۔ کچھ شریف لوگ تو شاید اسی دن کے منتظر تھے۔ میرے مرغزار شباب پر کئی بجلیاں ٹپکیں۔ انہی لوگوں کی صحبت میں رہ کر میں کچھ سمجھ دار ہو گئی۔ نوکری پہلے ہی چھوٹ چکی تھی، لیکن پھر بھی میری اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔"

"بھائی چھوٹ کر آیا تو مجھے اس حال میں دیکھ کر وہ بہت بگڑا۔ آخر میں نے ایک بار پھر چولھا چکی سنبھالا۔ بھائی ہٹ دھرمی کے ساتھ محنت مزدوری کرنے لگا۔ مگر بہت جلد ہمیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا۔ سمندری درندوں نے ہمیں کہیں چین نہ لینے دیا۔ پھر ہم اسی جزیرے پر آ گئے۔"

"بھائی کے مجبوراً خاموش ہونے پر محلّے کی پنچایت چیخ اٹھی۔ بھائی بے دلی سے خوش ہوا تو سماج ناخوش ہو گیا۔ آئے دن پنچایت بیٹھنے لگی۔ مشورے ہونے لگے۔ رائیں قائم ہونے لگیں۔ آخر ان کی ایک تجویز کے تحت ہم کو محلہ چھوڑنا پڑا۔ پھر ہم نے بازارِ حُسن پر ایک کوٹھا لیا۔ ناچ گانا سیکھا۔"

"اب میں ریحانہ بن گئی۔ میری خواہش میرے ادنیٰ سے اشارے پر پوری ہونے لگی۔ آرزو حسرت بن کر نہ رہی۔ نہ کبھی میرے مانوں نے اپنے حسین گلے پر الٹی چھری پھری۔

تہہ تاراج کرتی ــــ آزاد پنچھی کا کوئی صیاد نہ تھا۔ نہ کسی کا ڈر ـــــ نہ خدا کا ـ نہ دوزخ کا'
مجھے ڈر ہوتا کیوں؟ میرا کوئی خدا نہیں ' میرا کوئی مذہب نہیں۔ میں صرف روپے کی پرستش
کرتی ہوں۔ روپیہ میرا خدا ہے' میرا مذہب ہے ۔ جب رات کی تاریکی میں میری عصمت لوٹی
گئی ۔ میں بے بس تھی ۔ حسن اور جسم فروخت کی دکان لگانے کے بعد میں نے اپنے کرم فرماؤں
سے بدلہ لیا۔ ان شریف زادوں اور رئیس زادوں سے بدلہ لیا جنہوں نے ایک یتیم کو گناہ کے
غار میں ڈھکیل دیا تھا۔

لیکن میں کبھی کبھی سوچا کرتی ہوں ، کبھی کبھی تنہائی میں جیسے مجھ سے کوئی سوال
کرتا ہے آخر یہ سب کیوں ؟ اگر یہ سب نہ ہوتا تو کیا ہوتا ؟ کیا میرا بھی کوئی گھر ہوتا ؟"

" اگر میں تم سے شادی کر لوں تو ....؟"

حمید نے اس قدر اچانک سوال کیا کہ ریحانہ تھوڑی دیر اس کی طرف حیرت سے
دیکھتی رہی ۔ پھر اس نے پوچھا :

" تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ؟"

حمید نے جواب دیا :

" میں نے پوری سنجیدگی سے کہا ہے ریحانہ ...."

" شاید میری رام کہانی سننے کے بعد تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہے ۔"
ریحانہ بولی ۔" شاید تم مجھے گناہ کے اس گہرے اندھیرے غار سے نکالنا چاہتے ہو ۔ مجھے
معلوم ہے ۔ یہاں کی کچھ سر پھری لڑکیاں اپنے اپنے عاشقوں کے ساتھ بھاگ گئی تھیں ۔
لیکن ان کا انجام کیا ہوا ؟ تم یہ جاکر تو بہار اور لاجونتی سے پوچھو ۔ تم مجھ سے بہت قریب
ہو لیکن اس سے گہرا رشتہ ہمارے لیے ایک مصیبت بن جائے گا ۔ زمانہ بے وقت کی یہ شہنائی
سننا گوارا نہیں کرے گا ۔"

" کیا تم پھر سے ایک چھوٹا گھر نہیں بنانا چاہتی ہو ؟" حمید نے دریافت کیا۔

"یہ آرزو کب کی مر چکی۔ جب میں نے پہلی بار یہاں قدم رکھا تھا تو میرے اندر کی عورت مر چکی تھی۔۔ اور تم یہ کہتے ہو کہ میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد بازارِ حسن ختم ہو جائے گا۔ یہاں چار سو عورتیں دکان لگائے بیٹھی ہیں اور ایسی کتنی ہیں جو خفیہ دکانیں چلاتی ہیں۔ کیا اس سماج میں ایسے چار سو حمید ہیں؟ جو ان ریحاناؤں کو اس گندگی سے نکال کر ایک بار پھر نکھری پاک اور صاف فضا میں لے جائیں گے۔ اور پھر میرے بھائی کا کیا ہوگا؟ میں اسے کتنا پیار کرتی ہوں۔ میرا بھائی جو کبھی نہیں ہنستا کبھی نہیں روتا۔ جو ہر وقت شراب کے نشے میں یہ بات بھولنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی بہن طوائف ہے۔۔ میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی ــــ شاید ایک دن تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ میں طوائف ہوں، یقیناً ہمارے بچوں کے ساتھ لوگ اچھا سلوک نہیں کریں گے۔ شاید ایک دن تم مجھے چھوڑ دو گے۔ کیا یہ پاگل پن نہیں ہے؟"

"حمید ــــ اب تو میری لاش ہی یہاں سے جا سکتی ہے یا اس دن جب سماج بازارِ حسن کو ختم کر دے اور یہ سمجھنے لگے کہ طوائف بھی عورت ہو سکتی ہے جس طرح عورت طوائف بن سکتی ہے۔ کیا ایسا دن کبھی آئے گا؟ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے پانے کی ضرور کوشش کرو گے۔ جب تم واپس آؤ گے تو میں پھولوں کا ہار لیے تمہارا خیر مقدم کروں گی۔"

حمید کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر وہ چپ چاپ ریحانہ منزل کی سیڑھیاں اتر گیا۔ باہر گلی میں اجالا ہونے کے باوجود کہیں کہیں اندھیرا گہرا تھا۔ اس نے اندھیرا دور کرنے کے لیے دیا سلائی جلائی اور راستہ تلاش کرنے لگا۔

••

مٹّی کی مورت

"جا رادھا! موہن روٹی کھا رہا ہے۔ شاید اسے کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے۔"

"جاتی ہوں۔" رادھا بولی۔ ... "بی بی جی۔ ایک بات۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔"

"کہو۔" عزیزہ نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

روبا۔" رادھا نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ باغیچہ زمین کے مکھڑے پر معصوم بچے کی مسکراہٹ کے مانند پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بیچ میں چھوٹا سا دل کش بنگلہ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے بچے کی بغل میں خوب صورت سا کھلونا ہو۔ نازنگیوں کے قریب ٹین کے شیڈ میں بیل بندھے جگالی کر رہے تھے۔ بنگلے کی سیڑھیوں پر کتا اونگھ رہا تھا۔ گیلری میں موہن، رادھا کا خاوند روٹی کھا رہا تھا۔

"نہیں۔ آپ بُرا مان جائیں گی۔"

"تم کہو تو سہی۔ میں بُرا نہیں مانوں گی۔" عزیزہ نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"بات تو کہنے کی نہیں۔ لیکن کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔"

"آخر کہو بھی تو۔" عزیزہ نے کتاب بند کر لی۔ "کیا بات ہے؟"

"میں کہہ رہی تھی کہ۔ آپ یہاں روبا کا آنا جانا بند کر دیں۔"

"کیوں؟" اس نے لاپرواہی سے سوال کیا۔ "کیا ہوا؟"

"روبا تو بہت ہی بھولا ہے۔ وہ تو مٹی کی مورت ہے۔ بالکل مٹی کی مورت! جو چاہے اسے توڑ مروڑ کر رکھ سکتا ہے۔"

رادھا بولی: "میں نے کب کہا کہ وہ بُرا ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں داجی نہ بگڑ جائیں۔ کیوں کہ جب دیکھو وہ یہیں بیٹھا رہتا ہے۔ اور آپ جانتی ہیں کہ داجی کتنے سخت گیر انسان ہیں۔ روپا ان سے کس قدر ڈرتا ہے۔ اس کی روح کانپتی ہے ان سے بات کرتے وقت۔ روپا کا یہاں گھڑی گھڑی آنا اور آپ کا گھنٹوں اس سے نہ جانے کون سی باتیں کرنا۔ لوگوں کو کھٹکنے لگا ہے۔ کسی کی زبان تو پکڑی نہیں جا سکتی۔ لوگ بہت کچھ کہنے سننے لگے ہیں۔ میں نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ ـــ

"رادھا۔ ارے رادھا۔" موہن نے رادھا کو پکارا۔

"آتی ہوں۔" رادھا نے گود میں سوئے ہوئے بچے کو کاندھے پر ڈالتے ہوئے آواز لگائی۔

"کیا کہنے لگے ہیں لوگ۔" عزیزہ نے اشتیاق ظاہر کیا۔

"یہی کہ ـــ" رادھا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہی کہ آپ دونوں میں پریم ہو گیا ہے۔ اور کہ کیا کچھ ـــ"

عزیزہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ رادھا نے مڑ کر حیرت سے اسے دیکھا اور پھر آگے بڑھ گئی۔ ہنسنے میں جوں ہی عزیزہ کے ہاتھ اٹھے، کتاب کی خوب صورت جلد پر "آہنگ" نظر آنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے پھر وہ کتاب پڑھنے میں منہمک ہو گئی۔

جسونتری میں قدیم زمانے سے کہلاتے آئے داجی خاندان کے لمبے چوڑے کھیت سے لگا ہُوا شیرازی کا باغ تھا۔ عزیزہ جو بذاتِ خود ایک مکمل گلشن تھی، جو بلا کی حسین تھی اور جوانی کی دل کشی اپنے اندر رکھتی تھی۔ کنویں سے ذرا ہٹ کر موٹ کے ستون سے پیٹھ لگائے کتاب پڑھ رہی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی جن میں ذہانت کی چمک تھی۔ بیضوی چہرہ جس سے سنجیدگی اور متانت کا اظہار ہو رہا تھا، بہت ہی جاذب نظر تھا۔ اس کی عمر مشکل سے بیس بائیس برس کی رہی ہو گی۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ شہر کے ایک تعلیم یافتہ

گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے ماں باپ کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا۔ صرف ایک بھائی تھا۔ اسے عزیزہ پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی بہن میں اب سوچنے سمجھنے کی تمیز آ چکی ہے اس نے اس کی شادی کا معاملہ بھی اس کی مرضی پر چھوڑ رکھا تھا۔

وہ اپنی کتب بینی کے شوق کی وجہ سے یہاں مقیم تھی۔ رضیہ صرف دو دن اس کا ساتھ دے سکی تھی۔ پھر وہ شہر چلی گئی تھی، جہاں اس کا شوہر کاروبار کے باعث سکونت پذیر تھا۔

کوئی بھی چیز ہو، چاہے کتنی ہی حسین ہو، اپنے میں کتنی ہی جاذبیت رکھتی ہو جب عام شاہراہوں سے ہٹ جاتی ہے یا دور ہو جاتی ہے تو اس کی قدر و منزلت کم ہو جاتی ہے، اسی کے پیشِ نظر اگر ہم جیسو ندی، روپا اور عزیزہ کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے۔

ہر نئی چیز کو مقبولیت عام حاصل کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ لیکن دنیا میں کئی چیزیں ایسی ہیں جنہیں وقت بھی ملا مگر خوش نما اور دل کش ہونے کے باوجود آج بھی اسی مقام پر ہیں جہاں روزِ اول تھیں۔ یہی حال جیسو ندی کا ہوا۔ ریل گاڑی اور موٹر کی سڑکوں سے کافی دور ہونے کے باعث وہ ایک معمولی دیہات ہو کر رہ گیا۔ پورنا ندی کے کنارے ہونے کی وجہ سے وہ کافی خوب صورت اور دل کش نظر آتا۔

پوری بستی کور کوؤں، بھیلوں اور چند دیگر ذات کے لوگوں پر مشتمل ہے، دوسرے چھوٹی چھوٹی ذات کے لوگ جن میں مہار زیادہ ہیں پورنا ندی کے کنارے معمولی قسم کی ٹوکریاں اور جھاڑو وغیرہ بنا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

زندگی کو خوش گوار اور پُر سکون بنانے والے شعبے یہاں سرے سے موجود نہیں، اسی طرح روپا تعلیم و تربیت سے بے بہرہ تھا۔ زمانے کے نشیب و فراز سے اس کا دور کا بھی واسطہ

نہ تھا، جس کے باعث وہ بے وقوفی کی حد تک سیدھا تھا۔ اس کی عقل تالاب کا پانی ہو کر رہ گئی تھی، کیوں کہ اس کے ماحول نے اسے بُری طرح جکڑ رکھا تھا۔ حالاں کہ اس کی شکل وصورت سے اس چیز کا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ معمولی دیہات کا رہنے والا ہے۔ اس کا رنگ گندمی تھا سینہ کشادہ، بازو بھرے ہوئے، چہرہ کتابی، آنکھیں نیلی ــ گہری جھیل کے مانند تھیں ــ وہ مردانہ حُسن کا مکمل نمونہ تھا۔

وہ داجی کے کھیت کی رکھوالی کرتا تھا۔ اس کی بڑی بہن اور بیوی کے علاوہ داجی کے کھیت کے گھر میں بھی چھوٹے چھوٹے مختلف کام پر معمور تھیں ۔ وہ ذات کا مہار تھا۔ کسی سے بھی بالخصوص داجی سے بات کرنے میں اس کی آواز گلوگیر ہو جاتی۔ اگر کوئی اسے ذرا بھی ڈانٹ دے تو اس کا چہرہ فوراً روہانسا ہو جاتا اور گھنٹوں اس پر سے یہ کیفیت نہیں اترتی۔

عزیزہ کا جائزہ لیتے وقت ہمیں ذرا گہرائی میں جانا پڑے گا۔ یہ چیز ایک حد تک صحیح ضرور ہے کہ عزیزہ اپنی مخصوص روش سے ایک حد تک ہٹ گئی تھی۔ لیکن ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جس سے لوگوں کے شکوک یقین میں بدل جائیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس کا میل جول کافی حد تک بڑھ گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے میں کافی دلچسپی لے رہے تھے۔ لوگوں کا ان کے متعلق اس طرح سوچنا ٹھیک بھی تھا۔ کیوں کہ ان میں دوستی اس حد تک بڑھ گئی تھی جہاں سے شک کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔

روپا اکثر داجی کا کھیت چھوڑ کر شیرازی کے باغ میں آجاتا اور پھر وہ دونوں گھنٹوں باتوں میں مشغول رہتے ــ دیکھا جائے تو یہ بات ناقابلِ یقین تھی کہ ایک تعلیم یافتہ گھرانے کی لڑکی جو خود بھی بی اے تک تعلیم پا چکی تھی ایک کھیت کے رکھوالے سے اس طرح میل جول بڑھائے۔

عزیزہ خود کبھی کبھی شعروشاعری کا ذکر چھیڑ دیتی تھی۔ آج بھی وہ کنوئیں کے چبوترے سے ملی ہوئی منڈیر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ روپا سامنے بیٹھا تھا۔ عزیزہ کہہ رہی تھی، کہ جس طرح ایک خاندان کے افراد اپنی بساط اور اہلیت کے مطابق مل جل کر کام کرتے ہیں، عورتیں گھر

سنبھالتی ہیں، مرد باہر کا کاروبار دیکھتے ہیں۔ جب جاکر ایک گھر چلتا ہے۔ اسی طرح سماج کے افراد مل کر کام کرتے ہیں، اسی لیے وہ مختلف پیشوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کوئی زمین کا سینہ چیر کر اناج اگاتا ہے، کوئی خون پسینہ ایک کر کے مکان بناتا ہے۔ کوئی کپاس کو کپڑے کی شکل دیتا ہے، جب جاکر یہ "دنیا" چلتی ہے۔ کام کے بٹوارے سے ہی سوسائٹی یا سماج کی تشکیل ہوئی۔ سماج بنانے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ مل جل کر رہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں۔

سماج نے افراد کو کاموں کے لحاظ سے تقسیم کیا۔ ہندوؤں میں اسی چیز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے چار ذاتیں وجود میں آئیں۔ دیکھا جائے تو پیشوں میں کوئی اعلیٰ و ادنیٰ نہیں ـــ یہ تفریق تو بعد میں پیدا ہوئی۔ لوگوں سے زبردستی منوایا گیا کہ فلاں پیشہ کرنے والے افضل ہیں۔ مجبوراً لوگوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ خود غرض لوگوں نے فلاں پیشہ کرنے والوں کو ادنیٰ کہا۔ بے بسوں اور بے کسوں نے بے دلی سے حامی بھر لی۔

سماج پر عزیزہ نے بڑے جچے تلے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ہر نکتے کو سمجھانے کا ڈھنگ بہت ہی نرالا اور پیارا تھا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ گتھی کو وہ منٹوں میں سلجھا دیتی۔ مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق وہ گفتگو کرتی۔ لب و لہجہ کی مٹھاس سننے والے کو اس کا گرویدہ بنا دیتی۔

وہ کہہ رہی تھی ـــ ذات اور پیشے کی طرح لوگوں نے مذہب میں بھی ملاوٹ کر دی۔ اپنا الو سیدھا کرنے والوں نے مذہب کی شکل بگاڑ کر رکھ دی۔ تمام مذاہب ہمیں محبت ہمدردی، بھائی چارے اور خدمتِ خلق کا عظیم درس دیتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب یہ نہیں سکھاتا کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوں۔ تمام مذاہب کی منزل ایک ہے ـــ میں نے اس ایک ماہ کے عرصہ میں محسوس کیا ہے کہ تم بھی سماج کے شکار ہو۔ تم سے انسانوں کا سا سلوک نہیں کیا جاتا۔ تم سے چھ چھ اور سات سات آنوں میں وہ کام لیے جاتے ہیں جن پر انتہائی دکھ اور افسوس

ہوتا ہے، لیکن تمہاری بات تو یہ ہے ؎

میری بربادیوں کا ہم نشینو!

تمہیں تو کیا، مجھے غم نہیں ہے

اگر تم.....!

یکایک روپا کی نظریں نئی چپل پہ جا پڑیں، جو ستون سے رکھی ہوئی تھی۔ اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکا۔

"یہ یہ — تمہاری ہیں —" اس نے عزیزہ سے سوال کیا۔

"جی ہاں —" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"موہن شہر سے لایا ہے۔ تمہاری چپل کہاں ہے؟"

"داجی کے کھیت میں پڑی ہے۔"

"وہاں کیوں پڑی ہے؟ پیر میں کیوں نہیں؟"

روپا سے کوئی جواب نہ بن سکا۔ وہ کھسیانہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے گیلری میں موہن اور رادھا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بنگلہ اداس کھڑا انہیں تک رہا تھا۔ عزیزہ پھر کتاب پڑھنے میں منہمک ہو گئی۔

چپل ذرا تنگ تھی لیکن پنجہ ذرا سکیڑ لینے سے بہ آسانی پہنی جا سکتی تھی۔ روپا نے چپل پہن کر انگلیوں کو اوپر اٹھایا اور پنجہ تان لیا۔ اوپر جالی بنے ہوئے خوب صورت تلے اور مضبوط تلے کے درمیان تناؤ کے سبب چرر چرر کی آواز ہونے لگی۔

"او رے روپا — او رے روپا —"

آواز روپا کی بڑی بہن کرشنا کی تھی جو باغ سے لگے داجی کے کھیت سے آ رہی تھی۔

"دیکھو —" عزیزہ روپا سے مخاطب ہوئی جو ابھی تک چپل میں مگن تھا "تمہیں

کرشنا پکار رہی ہے۔ تمہیں یہ پتہ ہی نہیں تمہاری کسی اور کو بھی ضرورت ہے۔ جہاں لگے رہتے ہو۔ بس لگے رہتے ہو۔"

"مگر یہ تو ۔۔۔ یہ تو ۔۔۔"

روپا کے پیروں میں اپنی چپل دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ٹھیک ہو تو رہنے دو۔"

روپا نے شکر گزار نظروں سے عزیزہ کو دیکھا اور یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا:

"رات داجی کے ہاں منڈلی بلائی گئی ہے کیوں کہ آج گوکل اشٹمی ہے نا۔ تم آؤ گی نا ۔ کہیے۔"

"آہے روپا۔ روپا۔" آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

"آوت ہوں ۔۔۔" روپا نے بھی تان لی۔ اس نے کانٹوں کی باڑھ کو پھاندا اور آگے بڑھ کر جوار کے پودوں میں گھس گیا۔ وہ سینے سے کتاب لگائے کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی، نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وہ بنگلے کی طرف بڑھ گئی۔ گیلری میں پہنچ کر اس نے رادھا کی گود میں دودھ پیتے بچے کی ران میں چٹکی بھری۔

"اوں۔ اوں۔" رادھا بچے کو بہلانے لگی۔ بچہ جو چٹکی کی وجہ سے دودھ پینا چھوڑ چکا تھا پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

یکایک موہن نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا:

"بی بی جی! مالکن رضیہ نے چٹھی دی ہے۔ مَیں تو بھول ہی گیا تھا۔"

اس نے موہن کے ہاتھ سے چٹھی لی اور کمرے میں داخل ہو کر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا:

اچھی عزیزہ!

دو تین مرتبہ تمہاری چٹھی پڑھ لینے کے بعد بھی مَیں تمہاری تازہ "زندہ تخلیق" سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اس میں پلاٹ کی جدت، کردار نگاری کے کمال اور پھر دل کش سحر بیانی

کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ تمہاری سنجیدہ مزاجی کیا ہوئی؟ تمہارے لب و لہجہ کی مٹھاس جو ہر ایک کا دل موہ لیتی ہے کیا صرف کھیت میں کام کرنے والے رویا کے لیے وقف ہو گئی ہے؟ — تمہاری شخصیت پر رویا کی انفرادیت اثر پذیر ہوتی جا رہی ہے۔

چلو مان لیتے ہیں کہ تمہارا جیتا جاگتا کردار رویا بالکل دو سو سال پرانا انسان معلوم ہوتا ہے جس کے خدوخال کے پیچھے معصوم بچے کی روح جلوہ گر ہے۔ اسے دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پرانے زمانے کی ان شہزادیوں کی طرح تہہ خانوں میں پالا گیا ہو جنہیں آسمان دیکھنا بھی بدشگونی تصور کیا جاتا تھا۔

عزیزہ — ہوسکتا ہے رویا تمہارے حسین اور چست جملوں کی طرح پیارا ہو، اس میں اتنی ہی جاذبیت ہو جتنی تمہارے مکھڑے میں ہے۔ کیا تم اس کا اقرار کر سکوگی کہ غیر شعوری طور پر تم اسے چاہنے لگی ہو؟ تمہارے ذہن میں ایک خلش ہو جسے انتقامی جذبہ بھی کہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے تمہیں نظرانداز کر دیا ہو، اور تم اسے اپنی توہین، پرکشش شخصیت کی توہین تصور کر کے جل اٹھی ہو۔

ہر کسی کے دل میں عشق کا وہ سوز، وہ چبھن، وہ تڑپ پیدا کر دینا جو میر و غالب کے دل میں تھی، جو منٹو اور مجاز کی زندگی میں رچی بسی تھی، کھیل نہیں۔ عشق کی باریکیوں کو۔ جو ذہن سوچ بھی نہیں سکتا، وہ عشق کے آداب بھلا کیا بجا لائے گا؟

اور پھر سوچو — ظفر کا کیا ہوگا، جو صرف تمہاری ہلکی سی مسکراہٹ کے لیے اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ جو تمہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے — خیال کرو، جب وہ تمہیں اپنی نظروں سے رویا کے ساتھ دیکھے گا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی؟ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پھر وہ کیا کر بیٹھے گا۔ تم تو اس کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو — تم یہ خیال ہرگز اپنے دل میں نہ لانا کہ میں جانب داری سے کام لے رہی ہوں۔ میں سچ کہتی ہوں کہ تم مجھے اتنی ہی عزیز ہو جتنا ظفر، جو میرا سگا بھائی ہے۔ آج جب وہ علی گڑھ

سے واپس آیا تو تمہارے متعلق افواہ سن کر وہ بہت بگڑا۔ اگر میں اسے نہ روکتی تو وہ سیدھا تمہارے پاس آ رہا تھا اور پھر نہ جانے کیا ہوتا!

سوچا تھا کہ تمہارے بھائی شفیع کے کلکتہ ٹریننگ پر جانے کے بعد دو ماہ تک خوب گزرے گی، دنیا بھر کی باتیں ہوں گی۔ سیر سپاٹے ہوں گے۔ لیکن تم باغ کیا گئیں، وہیں کے ہو کر رہ گئیں۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟ بدنامی مول لینے میں تمہارا مقصد؟ مجھے تو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا اس دورانہ کاز عشق میں۔ پھر تمہاری مرضی۔

میں تمہیں نصیحت تو نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم جو قدم اٹھاؤ گی وہ نپا تلا ہوگا۔ تم ایسا کوئی کام نہ کرو گی جس سے تمہاری انفرادیت، سیرت اور شخصیت مجروح ہو جائے امید کہ تم میری تلخ بیانی کو معاف کرو گی۔

ہو سکے تو کچھ دن کے لیے شہر آ جاؤ۔ تمہارے جیجاجی اور ظفر کی بھی یہی خواہش ہے۔ اور کوئی خدمت!

تمہاری

رضیہ شیرازی

عزیزہ نے پلنگ پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس الجھن کا حل کیا ہوگا اس کا ذہن یہاں آکر بری طرح گتھ گیا۔ خیالات کا چکر چلتا رہا۔ نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

باغ اس معصوم بچے کی طرح سویا ہوا تھا جو نیند میں بھی مسکرا رہا ہو۔ پرسوز ترنم میں وہ مجاز کی نظم "آوارہ" پڑھ رہی تھی۔

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پہ تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصوّر، جیسے عاشق کا خیال
آہ! لیکن کون جانے کون سمجھے دل کا حال

باغ کی فضا پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ ایک سناٹا ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھایا ہوا تھا۔ خالقِ کائنات نے اسے بڑی ہی پیاری آواز عطا کی تھی۔ وہ اپنے گلے کے پورے سوز و

گداز سے نظم پڑھ رہی تھی۔

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بجز عزیزہ کی ترنم ریز آواز کے ہر سو خاموشی طاری تھی۔

یکا یک روپا کی آواز سنائی دی۔ اس نے کتاب رکھ دی۔ اور گیلری میں آکر دیکھا۔ سامنے روپا کھڑا تھا۔

"کون — روپا — آؤ" عزیزہ نے پوچھا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں!" روپا نے گیلری میں قدم رکھا۔ "داجی کے یہاں بہت انتظار کیا لیکن تم نہ آئیں۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ میں چلا آیا۔"

"میں تیار تھی —" عزیزہ نے کمرے میں واپس آکر کہا "لیکن نہ آسکی۔ کتاب پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اکتا کر پھر یونہی سوچنا شروع کر دیا۔ یہاں کی زندگی میرے پیشِ نظر تھی۔ تم میرے خیالات میں سمائے ہوئے تھے۔ سوچتے سوچتے سینے میں ہوک سی اٹھنے لگی۔

"کیا سوچا جا رہا تھا؟" روپا نے سوال کیا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ تم سوال کرنے کے قابل ہو گئے ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے تم نے بتایا تھا کہ جب تم دس بارہ سال کے تھے تو ایک دن تم نے داجی کو کرشنا سے چھیڑ چھاڑ پر ٹوکا تھا اور آپے سے باہر ہو کر داجی نے تمہیں بری طرح زدو کوب کیا تھا۔ یاد ہے نا؟"

"ہاں! اس دن کی مار تو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔"

"اور پھر" عزیزہ بولی "شادی کے بعد جب بھی تم لسنتی سے بات کرتے، تو

داجی بُری طرح خفا ہو کر تمہیں ڈانٹ دیا کرتے۔ ایک دن جب تم بسنتی سے بات کر رہے تھے، تو اتفاق سے ادھر سے داجی گزرے۔ انہوں نے تمہیں لعنت ملامت کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب دیکھو باتیں کرتے رہتے ہو۔ کام ذرا بھی نہیں کرتے ـــ اور بسنتی کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ چلو گھر میں سب کام پڑا ہے۔ اسی دن سے تم سہمے سہمے سے رہنے لگے۔ کیوں .... ہے نا یہی بات؟"

"اوں، ہاں" روپا نے چونکتے ہوئے کہا۔ نہ جانے وہ کس خیال میں گم تھا۔

"صبح رادھا کہہ رہی تھی۔" عزیزہ نے بات پلٹی۔

"کیا کہہ رہی تھی رادھا؟" اس نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

عزیزہ نے مناسب اور موزوں الفاظ میں صبح کی تمام گفتگو دہرا دی۔

روپا اپنی عادت کے مطابق صرف سنتا رہا۔ اس کے دل کی کلی کھلی جا رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اسے پھولوں میں گھسیٹا جا رہا ہو۔ مسرت سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

عزیزہ بولی:

"لوگ کہتے ہیں کہ تم مجھ سے پریم کرنے لگے ہو ـــ کیا یہ سچ ہے؟" اس نے ترچھی چتون سے پوچھا۔

روپا ششش و پنج میں پڑ گیا۔ اس کی طاقت گویائی سلب ہو گئی۔

عزیزہ نے نشیلی آنکھوں سے اسے دیکھا اور انگڑائی لیتے ہوئے اپنی زلفِ پریشاں کو درست کرنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

ابھی وہ اچھی طرح سر پہ ہاتھ پھیرنے بھی نہ پائی تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی کے بازوؤں میں جکڑی جا چکی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ روپا کی گرفت سے چھٹکارہ پاتی، خلافِ قیاس اس نے اسے چوم لیا۔ وہ تڑپ اٹھی اس نے جھنجھلا کر ایک زور دار چانٹا اس کے گال پر جما دیا۔

روپا پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ بھونچکا ہو کر عزیزہ کو تکنے لگا۔

۔ خبردار!" عزیزہ اپنے پورے جاہ و جلال میں تھی۔ " جو تم نے پھر ایسی کوئی حرکت کی۔ تمہاری بیوی موجود ہے۔ وہ حسن و جمال کا بہترین مرقع ہے۔ لیکن وہ داجی کے چنگل میں بری طرح پھنسی ہوئی ہے۔ تم اس سے کتنے بے خبر ہو۔ پہلے اس بھیڑیے سے نجات دلاؤ۔ وہ تمہاری منتظر ہے نہ کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

روپا کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے دو ہی قدم آگے بڑھائے تھے کہ فضا میں آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔

آبادی سے دور باغ دن میں جس قدر حسین اور دلفریب نظر آتا ہے اسی قدر رات میں وحشت ناک ہو جاتا ہے۔ جھاڑیوں میں سرسراہٹ نے دونوں کے رہے سہے ہوش بھی گم کر دیے دونوں نے نظریں خلا میں گاڑ دیں۔ سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کچھ لمحوں میں جان پڑا کہ سامنے سے کوئی چلا آ رہا ہے۔

" کون ہے؟!" وہ چیخ پڑی۔

آواز آئی ۔

" میں ہوں ۔ میں ۔ ظفر۔"

آواز پہچان کر عزیزہ گھبرا اٹھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

جیسے ہی ظفر نے گیلری میں قدم رکھا اس کی نظریں روپا سے ٹکرائیں۔ غصہ میں اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ظفر کچھ کہتا، عزیزہ نے آگے بڑھ کر کہا:

" روپا۔ یہ روپا ہے۔ داجی کے کھیت میں کام کرتا ہے۔"

" ہوں ۔" ظفر نے تند لہجے میں کہا " صبح شہر چلنا ہے۔ تیار رہنا۔" اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

عزیزہ نے روپا کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اور ظفر کے پیچھے اندر چلی گئی۔ روپا کچھ دیر

کھڑا رہا اور آہستہ آہستہ گردن جھکائے باغ سے باہر چلا گیا۔

صبح ہو چکی تھی۔ سورج کافی چڑھ آیا تھا۔ وہ باغ چھوڑ کر جا رہے تھے تو روپا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بیل گاڑی جس میں وہ سوار تھے جب یوزنا ندی کے کنارے پہنچی تو یکایک بسنتی کی آواز سنائی دی۔

عزیزہ نے گاڑی رکوا دی۔ قریب آ کر بسنتی نے سر سے مٹی ٹوکری اتاری اور اس میں سے نئی چپل نکال کر عزیزہ کے سامنے ڈال دی۔

"کیوں ـ ؟"

" انہوں نے دی ہے۔" بسنتی نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ " اور کہا ہے اب میں اپنی چپل پہنوں گا۔ اب مجھے کسی کے جوتوں کا خیال نہیں۔"

●●

زندگی۔ زندہ باد

ندی کی طرف چڑھائی کے پاس جابر نے تانگہ چھوڑ دیا۔ دس منٹ کے اندر ہی وہ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ کوٹ اور جوتے ایک طرف رکھنے کے بعد اس نے اپنے ارد گرد نظریں ڈالیں۔

کھانا پکانے کے لیے چولھا ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ گراموفون ایک طرف عشقیہ راگ الاپ رہا تھا۔ قریب ہی کھانے پینے کا سامان بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا۔ درخت کے نیچے دو تین سائیکلیں بچے اور ماں کے مانند ایک دوسرے سے بانہیں ملائے سو رہی تھیں۔ جنہیں کھانا پکانے کا کچھ بھی سلیقہ تھا وہ چولھا سنبھالے ہوئے تھے۔ کچھ لڑکے حلقہ بنائے تاش کھیل رہے تھے۔

سب سے مزے کی بات تو یہ کہ انبارت میر یہاں بھی اپنا پتنگ اور ڈور لانا نہیں بھولے تھے۔ وہ زمین پر پتنگ کو چت گرا کر اس کے سینے پر "بکیل" لگا رہے تھے۔ پر پتی جس پر ڈور لپٹی جاتی تھی پھسل کر دور چلی گئی تھی۔

پانچ چھ دوست ایک طرف بیٹھے ادرک، لہسن اور پیاز وغیرہ چھیل کر مسالے بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ کچھ فاصلے پر دو تین ساتھی مل کر مرغے کا قتلِ عام کر رہے تھے۔

"ایک عجیب بات ذہن میں آ رہی ہے۔" جابر نے اپنے مخصوص فلسفیانہ لہجے میں بات شروع کی۔ "زندگی کبھی کبھی ایسے روپ دھارتی ہے جو چند دنوں تو مزے میں دانا چگتی ہے۔ بڑے مدبرانہ انداز میں اپنی کلغی اٹھا کر آواز بلند کرتی ہے۔ پھر کچھ دن غیر ہم جنس کے گرد دائرے بناتی ہے۔ اور پھر ایک دن کچھ لوگوں کی صلاح پر ندی کے کنارے اس کا قتلِ عام ہو جاتا ہے۔

"کیا آپ کا اشارہ احمد موٹو کی طرف ہے؟" ظفر صاحب نے پوچھا۔ کیوں کہ پکنک میں چھن چھناتی دلچسپی انہیں کی ہے۔

"ہو سکتا ہے۔" جابر نے گردن ہلائی۔

احمد موٹو بولا:

"جابے کیوں پریشان کرنے آ گیا ہے؟ کچھ کہہ دوں گا تو تجھے اپنا خاندانی غصہ آنے لگے گا۔"

سب ہنس پڑے۔ جابر سب کو ہنستا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ بشارت میر ابھی تک اپنے پتنگ کو پوری طرح چڑھا نہ پائے تھے۔ مولانا نثار پرتی اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھے۔

"پچیس سال ہونے کو آئے اور ابھی تک آپ کے کسی سے پیچ نہیں ہوئے۔" جابر نے پوچھا۔

انہوں نے پتنگ کی ڈور کو ہاتھ اونچا کر کے جھٹکا دیا اور جابر کی طرف بغیر دیکھے کہا:

" Wait "

جابر ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اب وہ تاش کے کھلاڑیوں کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس نے شاکر کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے دریافت کیا:

"کیوں بھئی حکم کی رانی پھنستی نظر نہیں آتی۔"

خاموشی۔

"ہاں پیارے یہ کام کی بات ہوئی۔" عمر نے کارڈ شطرنجی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ہم سب کی رانیوں کے بارے میں جان چکا ہے۔ مگر اپنی رانی کے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔ یہ طے شدہ بات ہے۔ یہ حضرت آج کل محبت کا کھیل کھیل رہے ہیں۔"

"ہمت سے کام لو شاکر۔" جابر نے صلاح دی۔ "آخر تم ڈرتے کیوں ہو اپنی

محبوبہ کا نام لیتے ہوئے۔ یہاں تو سب اپنے ہی اپنے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہم تمہارے کسی کام آئیں"۔

"۔۔۔ خاموش!"

ساتھیو!" جابر نے سب کو مخاطب کیا۔ "ہم نے اگر آج (شاکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ان کے محبوب کا پتہ نہ لگایا تو یہ اس دور کا بڑا حادثہ ہوگا۔ ہم سب کو ایک آدمی کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملائے ان کے محبوب کو جاننا ہے ۔۔۔" اور پھر ہاتھ اونچا کرتے ہوئے کہا:

"بڑھے چلو۔ رکنا تیرا کام نہیں۔ چلنا تیری شان"

"ضرور ... ضرور ...... We will try"

سب نے منظور کیا۔ جلدی ہی سب شاکر پر لد پڑے۔ چاروں طرف سے اُسے چھیڑا جانے لگا۔ چٹکیوں اور گھونسوں کا بھی اثر نہ ہوتا دیکھ کر جابر کی صلاح پر دو تین دوستوں نے اس کی ٹانگیں تھام لیں اور کچھ نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے قبضے میں لے لیے۔ حفاظت حسین نے بڑھ کر اس کی ناک تھام لی اور جابر نے اس کے منہ پر اپنا پنجہ مسلط کر دیا۔

شاکر نے ہاتھ پاؤں چلانا شروع کیا۔ مگر جلد ہی اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ جابر نے اسے ایک موقع اور دیا۔

"کیا اب بھی نہیں بتاؤ گے؟"

"خدارا ..... مجھے مجبور نہ کرو ....." شاکر نے جلدی جلدی سانس لیتے ہوئے التجا کی۔

"اچھا .... یہ بات ہے۔" جابر نے دوبارہ منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ... "دیکھتا ہوں آپ کیسے نہیں بتائیں گے۔"

منہ بند ہوتے ہی شاکر نے اپنی پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں چلانا شروع کیا۔ مگر اب کے گرفت بہت سخت تھی۔ کچھ ہی لمحوں میں اس کا سانس گھٹنے لگا۔ مجبور ہو کر اس نے

اثبات میں گردن ہلا دی۔

"سا..... سا....."

شاکر ہچکچایا۔

"سا.... سا..... کیا کر رہے ہو.....؟ جلد بتاؤ ـ" جابر نے

گھونسہ بھی تان لیا۔

"کون ہے؟"

"ش..... شکیلہ!"

جابر پر سکتہ طاری ہو گیا۔ حیرانی کی ایک لہر ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئی۔

شاکر ویسا ہی پڑا رہا جیسا پہلے پڑا تھا حالاں کہ اس کے ہاتھ پاؤں آزاد ہو چکے تھے۔

"کیا شکیلہ پروین۔؟ جابر کی چھوٹی بہن ـــــ؟!" کچھ نے اپنا تعجب ظاہر کیا۔

شاکر بے بسی سے ایک دوسرے کی صورت تکنے لگا۔ جابر کو اپنی طرف گھورتا دیکھ کر اپنی گردن جھکالی۔

جابر کی عقابی نظریں شاکر کے جھکے ہوئے سر پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر شخص کو یقین ہونے لگا کہ اب کچھ ہو کر رہے گا، کیوں کہ جابر کی سخت طبیعت کا سبھی کو علم تھا۔

جابر نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دباتے ہوئے تاش کی گڈی اٹھائی اور انہیں پھینٹنے لگا۔

"خیر۔!"

جابر کی آواز پر سب نے کان کھڑے کر لیے۔

"تاش کی گڈی میرے پاس ہے۔ پتے تقسیم کرنا میرا کام ہے۔ ہو سکتا ہے شاکر تم ہماری   میں آجاؤ۔"

اس مرتبہ شاکر پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کو اپنے کانوں پر یقین نہ آنے لگا۔ وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ اتنا مشکل مرحلہ منٹوں میں طے ہو جائے گا۔

"ایک بات ذہن سے جا رہی ہے۔" ظفر نے جابر کی نقل اتاری۔ "زندگی کبھی کبھی ایسا روپ دھارتی ہے جو ندی کے کنارے کسی کو چڑی کا غلام بنا دیتی ہے.... بولو.... انقلاب زندہ باد!"

حفاظت حسین نے نعرہ لگایا۔ "اور زندگی زندہ باد!"

پھر وہ سب نعرے لگاتے رہے ہنستے رہے۔

••

ہیڈ ماسٹر یا مدھو بالا

ہمارے اسکول میں ایک ماسٹر ہیں چراغ الحسن صاحب۔ انہوں نے خدا کے فضل و کرم سے بڑا ہی سادہ مزاج پایا ہے۔ سادگی چہرے سے کم اور باتوں سے زیادہ ٹپکتی ہے۔ بیوقوفی کی حد تک وہ بھولی باتیں کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ان کی ذہنی دُود ان کے شعور میں نہیں ڈھلتی۔ بلکہ جیسی اٹھتی ہے ویسی ہی زبان تک آجاتی ہے۔ ان کی گفتگو داؤ پیچ سے ویسی ہی خالی ہوتی ہے جیسی داؤ پیچ والی گفتگو کرنے والوں کے ذہن خلوص سے خالی ہوتے ہیں۔

ایک دن اسکول لگنے میں کافی دیر تھی۔ ہم ماسٹر لوگ ایک کمرے میں بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ نارمل اسکول کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ماسٹر چراغ الحسن صاحب نے بھی اپنی ٹریننگ کے زمانے کا ایک واقعہ سنایا۔

کہنے لگے کہ ایک دن نارمل اسکول کے "ش" صاحب لیکچر دے رہے تھے۔ دورانِ لیکچر مجھے ہنسی آگئی۔

ماسٹر صاحب کو ناگوار گزرا۔ اور انہوں نے کلاس میں شور مچانے کا الزام دھر کر دو روپے جرمانہ کر دیا۔ میں سپرنٹنڈنٹ کے پاس گیا۔ انہوں نے پوچھا:

"آخر تمہیں ہنسی کیوں آئی؟"

میں نے جواب دیا:

"وہ بات ہی ایسی کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے اگر کسی ندی میں بیک وقت ہیڈ ماسٹر اور مدھوبالا ڈوب رہے ہوں تو تم کس کو بچاؤ گے؟"

بتائیے، ہنسی کی بات ہے یا نہیں۔؟"

خیر بات آئی گئی ہو گئی۔

دوسرے دن ایک مباحثہ ہوا جس کا موضوع یہی تھا:

ہیڈ ماسٹر یا مدھو بالا۔

بہت سے لڑکوں نے تقریریں کیں۔ زیادہ لڑکوں نے ہیڈ ماسٹر کو بچانے پر زور دیا۔

جب میری باری آئی تو میں صرف اتنا کہہ کر بیٹھ گیا:

"ہیڈ ماسٹر کو بچا کر کیا کریں گے؟ مدھو بالا کو بچائیں گے تاکہ کئی ہیڈ ماسٹر پیدا کر سکیں۔"

آخر میں ایک لڑکے نے اس پر بڑی عمدہ تقریر کی۔ چراغ الحسن صاحب کے آخری اس جملہ پر تو مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی کہ جس لڑکے نے مدھو بالا کو بچانے کا خیال پیش کیا تھا اس کو سب سے اچھی تقریر کرنے پر میڈل انعام دیا گیا۔

••

نام :- اختر پرویز (سابق میونسپل کونسلر)

والد کا نام :- حاجی علی منشاء خان مرحوم

پیدائش :- ۷۔ اپریل ۱۹۳۲ء

زیرِ ترتیب :- "دہکتا ہوا انگارہ"

پتہ :- منشاء منزل۔ ۱۵۔ خانقاہ روڈ۔ برہانپور ۴۵۰۳۳۱ ایم پی

اختر پرویز عوامی تحریک کی بھٹی میں تپ کر نکلے ہیں اس لئے حقیقت نگاری اُن کے افسانوں کا جُزوِ اعظم ہے۔ اُن کے افسانوی کردار ایسے جیتے جاگتے اور زندہ کردار ہیں جن سے آپ کی مُلاقات کسی بھی شہر اور بستی کے کسی بھی کوچے میں ہو سکتی ہے۔ اندازِ بیان کی سادگی، اختر پرویز کی تحریر کو مؤثر بناتی ہے اور پڑھنے والے کو ایسا لگتا ہے کہ کوئی بڑے دھیمے اور مانوس لہجے میں اسے، ابھی ابھی پیش آنے والا کوئی قصہ کوئی واقعہ سُنا رہا ہے۔

اختر پرویز کی کہانیوں میں مُسلم معاشرے اور روز کی روزمرّہ زندگی کے مسائل اپنی اُلجھنوں کے ساتھ خاصے چونکا دینے والے انداز میں اُبھرتے اور قاری کے ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اپنے اس دیرینہ رفیق اور ہمدم کی کاوشوں کو کتابی شکل میں دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہو رہی ہے جتنی اپنی کسی تصنیف کو دیکھ کر ہوتی، مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ دن دُور نہیں جب وہ مُلک کے اچھے افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگیں۔

خلش جعفری

بمبئی ۸۔ نومبر ۱۹۹۰

سرورق، کتابت طباعت احمد حنیف پوانگی مالیگاؤں